PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

جلد ۱۲ | جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۸ء | شمارہ ۱، ۲

زرِ سالانہ ---- ۱۶ روپے
قیمت فی شمارہ --- ۳ روپے

پرنٹر پبلشر --- اسدیار خاں
مطبوعہ --- جواہر آفسیٹ پریس نئی دہلی
کتابت --- سلطانہ ریاض

مقامِ اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق پر: رشید امجد

پتہ: دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

فون نمبر ۲۷۶۸

Scanned by CamScanner

آئینہ

گوشۂ رشید امجد

*

*

مہدی جعفر
بی۔ ۱۳۵ شاستری نگر
بھوپال ۴۶۲۰۱۶

رشید امجد کی کائنات

حالیہ افسانے کے استحکام میں رشید امجد نے جو حصہ لیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مساعی نے افسانوی فن کو جلا بخشی ہے۔ رشید امجد کا افسانوی میدان شہری، واردات عصری، محسوسات زخمی، سوچ تفکیری، لہجہ شعری اور اظہار علامتی ہے۔ ان کی توجہ عصری افسانوی ساخت پر مرکوز ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ معنوی حیثیت سے وہ عناصر جہت پا جائیں جو موجود تو ہوں مگر گرفت میں نہ آ سکے ہوں، جو محسوس تو کئے جاتے ہوں مگر جن کا نقش نہ بنایا جاتا ہو، جنھیں لکھا تو جاتا ہو مگر ابھارا نہ گیا ہو، جنھیں سمیٹ کر لفظ تو دیا جاتا ہو مگر گھیر کر شکل نہ دی جاتی ہو، جن کی کہانی تو کہی گئی ہو علامتی صورت گری نہ کی گئی ہو۔

معنوی بصارت سے کائناتی بصیرت کے جنم لینے کا منظر رشید امجد کی افسانوی زبان کا امتیازی وصف ہے۔ ان کی پہچان وہ کاوش ہے جو بنے بنائے اور فرسودہ لسانی ڈھانچوں کو ایک ارفع جمالیاتی سطح پر لے جا کر بدل ڈالنا چاہتی ہے اور تازہ اور توانا اسلوب کی تخلیق و تہذیب کرتی ہے۔

موت کھلکھلا کر ہنسی۔ "میں تو تمھارے اندر ہی ہوں"۔
"تو پھر یہ باہر سے کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے"۔
"تم خود"۔
"میں۔" اس نے بوکھلا کر اپنے سارے وجود کو ٹٹولا۔
وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔
"تو میں اپنے جسم سے باہر ہوں اور موت اندر ہے"۔

(بے راستوں کا ذائقہ)

رشید امجد ماحول، موقع یا صورت حال کو علامت بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کردار اہم ہیں مگر اس قدر نہیں کہ اظہار کا سارا زور انھیں پر پڑے۔ کردار یا تو عصری پہچان واضح کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں یا بے شناختی کے نشان۔ 'طلسم بے در' کا کردار انسانی صفات کو مشینی صفات سے ممیز کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہ کردار ایک پورے دور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی سماجی سچویشن کی شناخت ابھارتا ہے۔

شہری ماحول کے علامتی بیانیہ کے طور پر رشید امجد 'شناسائی دیوار اور تابوت' میں لفظوں کو اشیاء اور گیند کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جمنہ ٹوٹ کر فرش پر گر جاتا ہے تو اسے اٹھا کر ڈاکٹر کی جیب میں ٹھونس دیتے ہیں۔ وہ اشیاء میں حساسیت بھر دیتے ہیں اور ان میں زندگی اور تحرک جگا دیتے ہیں۔ ماحول میں موجود ارد گرد کی بے جان چیزیں کبھی افراد کی طرح عمل اور ردِ عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں، جس سے افسانوی بیان میں طلسماتی جان پڑ جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں علامت کو ابھارنے سے پہلے بیانیہ کو لفظیاتی زیر و بم اور ساختیاتی جست و خیز کے ذریعہ طلسمی کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ شاید یہ اس لئے ہوا کہ مایوسی اور زخم خوردگی کا مجرد احساس سادے بیانیہ میں قاری کو غیر دلچسپ اور بے کیف کر دیتا۔ اسے موثر دینا ہے تو اس کی قلب ماہیت کرنی ہوگی۔

شناسائی دیوار اور تابوت، کی موضوعی حیثیت بنیادی طور پر عوض سعید کے کے یہاں 'رات والا اجنبی' کے مماثل ہے البتہ عوض سعید کے افسانے میں تجسیمی یا نامیاتی عمل مفقود ہے، جو علامتی تشکیل کا باعث ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ افسانہ اپنی تجریدی جہت کی بھرپور شناخت مرتسم کرتا ہے۔ حالانکہ رشید امجد نے افسانے کی طرح اس میں بھی ازدواجی زندگی کی مایوسی اور نفسیاتی خلیج ظاہر ہوئی ہے مگر 'رات والا اجنبی' کا استعارہ مافوق الفطرت نہیں ہے۔ دوسری طرف رشید امجد کے یہاں اچانک زن و شو کی خلیج سے ایک مافوق البشر ہیولے کی تجسیم افسانے کو علامتی جہت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ یعنی گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ عہد حاضر کی سچویشن اس طرح مدغم ہوتی ہے کہ عورت کی مرد سے بے اعتنائی اپنا داخلی آہنگ الگ بناتی ہے۔ چنانچہ عجیب الخلقت ہیولے کی تجسیم دراصل زن و شو کی علیحدگی کی تجسیم ہے۔ یہ ہیولا ایک ساز بجاتا ہے اور

اس کی آواز پر عورت اس وقت رقص کرتی ہے جب مرد موجود نہیں ہوتا۔ اس صورتِ حال کی PLURALITY کو اجتماعی طور پر بھی پہچانا گیا ہے۔ یہ انفرادیت یا فردیت کے اعتبار سے سماج کا حصہ ہے۔ پڑوسیوں کے یہاں بھی یہ ہیولا دیوار پر بیٹھا ہے اور اس کے ساز پر ہر پڑوسی کی عورت رقص کرتی ہے۔ اگرچہ کہ رشید امجد کی یہ علامت، تجریدی حیثیت کی قلب ماہیت سے تشکیل ہوئی ہے مگر یہ ہیولا سریندر پرکاش کے افسانوی کردار 'بجوکا' کے برخلاف کسی خارجی سے (شے کی آزادانہ حیثیت) کی داخلی تجسیم نہ ہو کر، داخلی صورت حال (صورت حال کی داخلی مگر آزادانہ حیثیت) کی داخلی تجسیم ہے، جسے خارج پر منعکس کیا گیا ہے۔ شہری ماحول کے واسطے سے رشید امجد کی تشکیل کردہ امیج میں اسطوری کردار کم ہے فینٹسی زیادہ۔ آرکی ٹائپ کے لحاظ سے یہ عورت کا ANIMUS ہے جو پہلے پہل داخلی ہوتا ہے مگر عمر بیتنے کے ساتھ اس کی اصلی صورت عورت کی طرف سے ایک مخصوص طرح کا ردعمل بن کر سامنے آتی ہے اور جس کا خمیازہ مرد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہیولے میں تاریخیت نہیں بلکہ ازلی کیفیت ہے۔ چونکہ افسانوی سچویشن شہری ہے۔ اس لئے مکانی طور پر یہ شہر کا سمبل ہے۔

یوں تو رشید امجد علامتی افسانہ نگار ہیں کہ ان کے یہاں کئی نہجوں کے نشیب و فراز سے گزرنے کا عمل ملتا ہے اور تخلیقی شدت ان کے اسلوب اور ہیئت کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ ایک شعری تاثیر بدرجۂ اتم پیدا ہو جاتی ہے مگر تمام افسانوں کی بنیادی تخلیقی رو کے طور پر وہ جینے کی زبردست خواہش کے افسانہ نگار ہیں۔

اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا۔ "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں"۔

(سہ پہر کی خزاں)

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ میری بیٹی ادھ کھلی آنکھوں میں نیند لئے بازو پھیلائے مجھے بلا رہی ہے۔ میں دھم سے بستر پر گر پڑتا ہوں۔ میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ نہیں کر سکتا۔

(میلا جو تالاب میں ڈوب گیا)

میں اسی تڑختے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے پاس جاؤں گا اور اس کی سوکھی چھاتیوں سے لپٹ کر۔ اس سے کہوں گا کہ وہ اپنے بند چشمے اس پر کھول دے۔

(ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک مکالمہ)

کوئی ہے۔ کوئی ہے، اس کی اپنی آواز چاروں طرف سے اس پر ٹوٹ پڑتی ہے، وہ نڈھال ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے، بہت دیر تک اسی طرح کھڑا رہتا ہے، پھر اپنے آپ کو اکٹھا کر کے آگے بڑھتا ہے۔ کلاس روم میں ڈیسکوں پر بستے کھلے پڑے ہیں، کاپیاں کھلی ہیں، بلیک بورڈ پر سوال لکھا ہوا ہے، لیکن نہ پڑھانے والا موجود ہے نہ پڑھنے والے، ایک گہری چپ ہے۔

یا خدا یہ کیا جادو ہے۔ لوگ اس شہر سے کہاں گئے ہیں۔ ہلکی سی آہٹ ہوتی ہے۔

کون؟ اس کے اندر تجسس کی لو بھڑکتی ہے۔

(قافلے سے بچھڑا غم)

فرد اور فرد کی اکائی کے زاویے سے پورے سماج میں زندگی کی طمانیت اور تازگی دیکھنے کی شدید خواہش رشید امجد کو ہولناک صورت حال منعکس کرنے پر اکساتی ہے۔ وہ بڑھتی ہوئی بے چہرگی میں شناخت کی راہ تلاش کرتے ہیں اور منجمد اندھیرے میں روشنی کی کرن ڈھونڈھتے ہیں مگر انھیں دھوپ میں سیاہ لکیر کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

رشید امجد سمجھنے کی قوت پر خاص توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ عقلیت کو وہ اس انتہا پر دیکھتے ہیں جہاں پہنچ کر اسے ناکامی کا سامنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں جا بہ جا طنز (SATIRE) کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ مرد کی دلیل پسندی میں اس کی طاقت اور تازگی کو پہچانتے ہوئے اسے ایسے کنارے پر کھڑا دیکھتے ہیں جہاں پر عقلیت کی ہوش مندی اپنی روح گنوا بیٹھتی ہے اور ایک اجاڑپن کا احساس جنم لیتا ہے۔

ب چپ چاپ اسے چائے پیتے دیکھتا رہا۔ اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ 'اس کے بعد ہم چپ چاپ اٹھے خاموشی سے باہر آئے اور کچھ کہے بغیر اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے!

ب اب بھی چپ رہا۔

"میں کیا کروں؟"

ب کے ہونٹ اس کے چہرے میں دفن ہو گئے۔

'میں کیا کروں ؟'
گہری الف خاموشی ۔
اس نے ب کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا ۔
ب کچھ مٹی کے کھلونے کی طرح بھر کر زمین پر بکھر گیا ۔
سنسان ویران سڑک پر دھند چپ چاپ قدم قدم چل رہی ہے ۔
(سہ پہر کی خزاں)

ایک گہری چپ ۔
صبح پہلے تیز گھنٹی ۔ پھر کوئی کندھے سے ہلا کر مجھے جگاتا ہے ۔
'آج دفتر نہیں جانا ؟'
'آئیے آئیے مسٹر الف آپ کیسے ہیں ؟'
'مزاج بخیر ۔ تشریف رکھئے نا ؟'
'السلام علیکم ۔ بہت دنوں بعد دکھائی دیئے ؟'
'آؤ بھائی آؤ نا ؟'
'بیٹے کیسے ہو ؟'
'ابو میری کاپیاں' ۔
'جان ۔ آج تو بہت دیر لگا دی آپ نے' ۔
مکالموں کا ایک لامتناہی جنگل ، لفظ اگتے چلے جاتے ہیں ، چہرے کبھی تو لفظ ہی ہیں ۔
لفظ ، لفظ ، لفظ ۔ بغیر ارادے کے منہ سے نکلتے چلے جاتے ہیں ۔
(رات تماشا عکس)

دوسری طرف رشید امجد عورت کی ہوش مندی کی ایک الگ سطح کو پہچان لیتے ہیں ، جو اپنے مختلف دلائل پر مبنی ہوتی ہے اور جس میں اس کی کمزوری اور طاقت دونوں مضمر ہوتی ہیں ۔ ان کے یہاں عورت کا اپنا تعقل مشکوک حیثیت رکھتا ہے ، یا محض مرد کی عقلیت کی پرچھائیں اور استقرائی عمل (INDUCTION) سے پیدا ہوتا ہے ۔ چونکہ عورت کی ہوش مندی کا سرچشمہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے تعلق سے پھوٹتا ہے ۔ اس لئے

اس کی مستقل کیفیت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مرد عورت کے آئینے میں تازگی سے مستفیض ہوتے ہوتے کبھی کبھی خشکی اور بے لطفی کا اسیر ہو جاتا ہے اور اپنی شناخت گنوا بیٹھنے کے خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے۔ آج کی صورت حال اس عمل کو مہمیز کرتی ہے۔

"ایک گھنٹہ تین منٹ لیٹ۔"

اس نے بے پروائی سے شانے جھٹکے اور بولی۔ "شاپنگ کے لئے نکل گئی تھی۔"

اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔

"میں۔"

"مجھے معلوم تھا تم انتظار کر رہے ہوگے۔" وہ ہنسی۔

"تم اور کر ہی کیا سکتے ہو۔"

"تم میری توہین کر رہی ہو۔"

"میں تو صرف دیر سے آنے کی وجہ بتا رہی ہوں۔"

"وجہ! خود کو محفوظ رکھنے کی ایک ڈھال۔ ہونہہ۔"

(سہ پہر کی خزاں)

"میں مر گیا ہوں۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں میں کہا۔ بیوی کے مونہہ سے چیخ نکلی، لیکن اگلے ہی لمحہ غصہ کھٹ کھٹ کرتا اس کے منہ پر پھیل گیا۔ "شرم نہیں آتی ایسا مذاق کرتے ہوئے۔"

"یہ مذاق نہیں۔" وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"میں سچ مچ مر گیا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے؟" بیوی جھنجھلا گئی ......

چائے کا آرڈر لے کر بیرا گیا ہی تھا کہ منیجر ان کی میز پر آیا۔ "کون ہو تم؟"

"میں۔ میں ہوں۔"

"اور یہ عورت؟"

"میری بیوی ہے۔"

"ثبوت ؟"

"بس یہ میری بیوی ہے۔"

"نکاح نامہ ہے تمھارے پاس ؟"

اس نے مڑکر بیوی کو دیکھا اور سوچا، اس عورت سے جو اس کے دو بچوں کی ماں ہے، اس کے تعلقات کیا ہیں، وہ اس کو مسلسل دیکھتا رہا۔

وہ بولی۔ "کیا دیکھ رہے ہو ؟"

"کچھ نہیں"۔ وہ بولا۔ "پھر کب ملوگی ؟"

"کیا ؟" وہ چیخ کر بولی۔ "تم مجھے گرل فرینڈ سمجھ رہے ہو ؟"

(بے راستوں کا ذائقہ)

ظاہر ہے عورت کی سوچ سمجھ کا نظام مرد کے اسی طرح کے نظام سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ البتہ دونوں کا نقطۂ اتصال اور قایم مقامی مرد کی فعالیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور جیسے جیسے مرد بلند فکری پر فائز ہونے لگتا ہے یا اسے حالات کی چکی میں پسنا پڑتا ہے اس کے قدم زمین چھوڑنے لگتے ہیں۔ اور نقطۂ اتصال معدوم ہونے لگتا ہے۔

چنانچہ بیوی کا ذکر جہاں جہاں آتا ہے اس کا خاص انداز ہے۔ رشید امجد عورت کی سمجھ اور مرد کی عقلیت میں دور تک تال میں دیکھنا چاہتے ہیں جو ایک دشوار امر ہے۔ وہ ازدواجی زندگی کے گٹھ جوڑ پر شاید اس لئے زور دیتے ہیں کہ زندگی کی راحت، جینے کی امنگ، اور باہم شناخت کا مسئلہ، بڑی حد تک اسی سے متعلق ہے۔

رشید امجد کے افسانوں میں فطری طور پر فرد کے لگاؤ کا عنصر بیوی سے زیادہ بچی میں ہے۔ بچی کی معصومیت کا نشان ہے۔ زندگی سے معصومیت کو شہر بدر کرکے جیا نہیں جا سکتا۔ یا برخلاف اس کے معصومیت کے سہارے زندگی گزارنا آسان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگلا راستہ معصومیت کے موڑ سے ہی نکلے گا جو GENUINENESS اور خلوص کو ہموار کرے گا۔ مگر فرد زندگی کی چکی میں اتنا پھنسا ہے کہ وہ معصومیت سے مربوط ہونے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کا تناؤ اور دباؤ ایک حدِ فاصل قائم کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے فرد اس قدر الجھا ہوا ہے کہ گھر ہوتے ہوئے بھی گھریلوپن نصیب ہونا ایک مسئلہ

بن چکا ہے۔

میں سوچتا ہوں ، ہماری قبریں اتنی دور دور کیوں ہیں لیکن میری قبر تو میرے ساتھ ہے۔ میں اپنے جسم پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ میری قبر نے مجھے چاروں طرف سے لپیٹا ہوا ہے۔ چاروں طرف قبریں ہی قبریں ہیں۔ مجھے خیال آتا ہے، ب اب قبر کے قریب ہوگا۔ لیکن قبر کیوں ؟ وہ تو اس کا گھر ہے۔ ب گھر سے اتنا ناراض کیوں ہے ؟ گھر اسے قبر کیوں نظر آتا ہے ؟ میں ماں کے مرنے کی دعائیں کیوں مانگا کرتا ہوں ؟" چیزیں الجھنے لگتی ہیں، گھر قبر کیوں بن گئے ہیں ؟ ہوٹل گھر کیوں ہو گئے ہیں ہ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھتا۔

(بیزار آدم کے بیٹے)

عام طور پر رشید امجد کے افسانوں میں قبر کا وجود کم و بیش مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے موت اور قبر کی استعاراتی حیثیت بڑھ چڑھ کر قائم کی ہے۔ ہر افسانہ اس استعارے کی نئی شناخت لے کر سامنے آموجود ہوتا ہے۔ یہاں قبر کا استعارہ گھریلو پن کی عدم موجودگی کے خلا کو ابھرتا ہے۔ مرکزی کردار سعی کرتا ہے کہ گھریلو پن کی جنت واپس آجائے، معصومیت پھر اس کی زندگی میں کھیلنے لگے، وہ معصومیت کی خواہش کو مطمئن کر سکے، مگر فی الحال ایسا ہونا ناممکن نظر آتا ہے۔

وہ سر اٹھاتا ہے تو ناچتا شعلہ گزر چکا ہے۔
آسمان کے طشت کے کناروں سے چاند منہ نکال کر اسے آنکھ مارتا ہے۔
بیوی دروازہ کھولتے ہوئے کوئی سوال نہیں کرتی۔
بیٹی کو گود میں اٹھاتا ہے تو ٹافیاں نہیں مانگتی۔
کھانے میں کچے گھی کی ہمک نہیں آتی۔
دیواروں سے سیلن کی بو بھی نہیں۔
صبح دفتر جاتے ہوئے مسکراہٹیں۔ ٹاٹا کی چہکار۔
دفتر میں میز پر کوئی PENDING فائل نہیں ہے۔

مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں۔

واپسی پر ٹی ہاؤس میں میز صاف ستھری، کوئی بکھرا ہوا لفظ نہیں۔
گھر آتے ہوئے جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچتا ہے تو دائیں بائیں پھر مڑ
کر دیکھتا ہے اور کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے
بیوی مسکراہٹ کا چراغ جلائے دروازہ کھولتی ہے۔
بیٹی دوڑ کر ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے

(بانجھ ریت اور شام)

رشید امجد کی اہمیت اسی موڑ پر نظر آتی ہے جہاں وہ ـــ 'کیا ہے' اور ـــ 'کیا ہو رہا ہے' کی عکاسی کرتے کرتے یکایک ـــ 'کیا ہونا چاہئے' کی سمت میں جست لگاتے ہیں۔ انھیں ـــ 'ان حالات میں کیا ہو سکتا ہے' میں دلچسپی نہیں۔ وہ آج کی صورت حال کے بانجھ پن کے درمیان رہتے ہوئے 'زرخیزی میں جینے کی طلب کو جگہ جگہ VISUALISE کرتے ہیں۔ یہ ایک اہم موڑ ہے۔

رشید امجد اپنے افسانوں میں مذہبی تلمیحات کا استعمال دو سطحوں پر کرتے ہیں۔ ایک سطح قدیم اور اوریجنل ہوتی ہے، اور دوسری سطح عصری ہوتی ہے۔ تلمیح جب عصری سطح کی نباضی کرتی ہے تو اپنی شکل بدل دیتی ہے یا دوسرے لفظوں میں اپنی قلب ماہیت کر لیتی ہے۔ رشید امجد جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ تلمیح کے TRANSFORMATION کے واسطے سے کہہ جاتے ہیں۔ وہ عصر حاضر کی بگڑی ہوئی حالت کی عکاسی کرتے کرتے ایسی سطح کی نشاندہی کرنے لگتے ہیں جہاں پر تازہ دم ہونے کی گنجائش ہو۔

"صبر کرو۔ صبر۔" میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں۔ "سارے
بچے اب اسی طرح بہتے ہوئے اب یہیں آئیں گے کہ اب ساری مائیں اپنے
بچوں کو یونہی نالیوں میں بہائیں گی۔"
"نالیوں میں کیوں؟" وہ چپ ہو کر سوال کرتا ہے۔
"دریا تو سارے خشک ہو گئے ہیں، اور شہر میں قتل طفلاں کی منادی
بھی ہو چکی ہے۔ مائیں بیچاری کیا کریں۔"

(سناٹا بولتا ہے)

یہاں تلمیح بیانیہ میں تحلیل ہو کر سامنے آئی ہے اور افسانے کی کلیت کا ایک جزو بن گئی ہے۔ تلمیح کا گھل جانے والا عمل اکثر افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہاں جگانے والا آگیا ہے۔ وہ دیکھو۔
دیکھو لوگ اس کے انتظار میں بارش میں بھیگ رہے ہیں۔
ہاں ان کے دل سچ کے ساتھ ہیں۔ وہ اس کے منتظر ہیں۔ لیکن اسے یاد آیا، انھوں نے کہا تھا۔ ہمارے دل تمھارے ساتھ ہیں۔
لیکن تلواریں۔
افسوس ہم اپنی تلواریں بیچ چکے ہیں۔
اس نے گھبرا کر اپنی تلوار کو دیکھا۔
لیکن میرے پاس تو تلوار ہے ہی نہیں۔ میری تلوار تو وہ پہلے ہی چھین کر لے گئے ہیں۔

(بے چہرہ آدمی)

اب تم بتاؤ میں کیا کروں ؟
اذیتیں میرے راستوں کے سبھی موڑوں پر چھپی ہوئی ہیں، گھات لگائے بیٹھی ہیں، اور میں قطرہ قطرہ مر رہا ہوں،
میں اس شہر میں جہاں ہر شخص اپنی خوشبو چھوڑ چکا ہے، اپنے خوشبودار جسم کے ساتھ کیسے رہوں ؟
. . . . . تو پھر تم نے کیا سوچا ہے ؟
کیا اب بھی بیعت نہیں کروگے ؟

(لا = ؟)

اوپر کے اقتباسات میں روایات کی طرف براہ راست اشارہ نہیں ہے، اس لئے کہ تلمیح کے عمل اور ردعمل کو پیش کیا گیا ہے، مگر اکثر جگہوں پر باقاعدہ اور واضح طور پر تلمیح کی کرافٹنگ ملے گی۔

ہم سب کے چہرے کھل اٹھے۔ دیوداسی نے ہاتھ باندھ باندھ کر ہواؤں میں کسی کو نمسکار کیا اور بولی۔ ہے بھگوان پورس اس دھرتی کا سپوت ہے،

تیرا بیٹا ہے، تیری دھرتی کا رکھ والا، اسے شکتی دیجیو۔ ہے بھگوان اسے شکتی دیجیو۔

ہم سب نے سر جھکائے اور اپنے اپنے راستوں پر چل نکلے۔
سکندر کتے، میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں، میرا ہیرو پورس ہے۔
(سمندر قطرہ سمندر)

اس کی آنکھوں کی کربلا میں بھوکے پیاسے خیمے ابھر آئے، پیاسے خیموں سے گھوڑا باہر نکلا اور اپنے سوار کو لے کر خون خون میدان میں قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

(ریزہ ریزہ شہادت)

افسانہ "ہابیل وقابیل کے درمیان ایک طویل مکالمہ" کی ساری بنت تلمیحاتی ہے۔

ظاہر ہے رشید امجد تلمیح کے ذریعہ "آج کی جو بے معنویت کی صورت حال ہے" اسے "معنی کی جو صحیح صورت حال ہونی چاہئے" سے ٹکرا دیتے ہیں۔ وہ معنی کی نئی دنیا کو VISUALISE کرتے ہیں۔ اچھی زندگی کو فنی طور پر خلق کرنے کے لئے وہ قدیم سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ رشید امجد تلمیح کا استعمال علامتی سطح پر کرتے ہیں۔ جس میں کبھی کبھی اسطوری سطح نمایاں ہونے لگتی ہے۔

رشید امجد کے یہاں بیانیہ کا الگ نشیب و فراز ہے۔ ان کے اسلوب میں ٹھوس ہیئت نظر نہیں آتی۔ مثلاً جیسی کہ انور سجاد کے یہاں ٹھوس کرافٹنگ ہے۔ وہ اس طرح کی کرافٹنگ نہیں کرتے بلکہ اپنے افسانوں میں گھلنے یا گھلنے والی صورت پیدا کر کے زخمی احساسات اور ماحول کی گرانی کو نہ صرف قابل برداشت بناتے ہیں، بلکہ کہیں کہیں لطیف کیفیت ابھار دیتے ہیں، جس میں طنز کا بھرپور وار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک افسانے میں گڑ کا ذکر کرتے ہیں جس میں ننگ دھڑنگ بچے شپ شپ کرتے دوڑتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں ایک بچے سے افسانے کا کردار سوال کرتا ہے۔

مگر تم کون ہو؟
ہم۔ ہم ربڑ کے غباروں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس گڑ کے اندر۔

ربڑ کے غبارے ؟

ہاں۔ وہ غبارے جو لوگ استعمال کر کے گٹر میں پھینک دیتے ہیں۔

(سناٹا بولتا ہے)

اسی طرح ایک اور جگہ بڑی سادگی اور سبک روی کے ساتھ طنز کچھ اس انداز میں داخل ہوتا ہے کہ افسانہ چلتا رہتا ہے اور طنز وار کرتا جاتا ہے۔

میں، وہ اور دوسرے سب دن کے روشن بازاروں اور رات کی کالی گلیوں میں اسے تلاش کرتے کرتے اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھتے ہیں، اور اب ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔

میں کون ہوں ؟

تم کون ہو ؟

وہ کون ہے ؟

وہ جو خوشبو کی طرح محسوس تو ہوتی ہے، دکھائی نہیں دیتی۔ (لیکن خوشبو تو صرف ان کے لئے ہے جو سونگھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں)

(خواب انتظار)

افسانہ قاری کے ذہن میں تحلیل ہو کر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ بوجھ کا احساس نہ ہوتے ہوئے بھی ماحول کا بوجھل پن اسے متاثر کرتا ہے۔ تحلیل ہونے والی ہلکی کیفیت انور سجاد کے افسانوں میں کم کم نظر آتی ہے، اس لئے کہ انور سجاد کے یہاں ماحول کی شدت اور کردار کے بوجھ کو بڑے ٹھوس انداز میں کرافٹ کیا جاتا ہے۔ افسانوی سبک روی رشید امجد کی تخلیق کو شائستہ مزاجی سے ہم کنار کرتی ہے۔

رشید امجد کے یہاں وقت کی صورت حال اور عصری حسیت، روزمرہ زندگی کی شناخت یا بے شناختی کے آئینہ میں پورے آب و تاب سے دیکھی جا سکتی ہے۔ نئی تراکیب نئے الفاظ اور محاورے جو ان کے ہاتھ آئے ہیں، بہترین آلے ہیں، جن کی نوک سے وہ عصری احساس کو ابھارنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رشید امجد کے یہاں فرسودہ الفاظ اور پرانے محاوروں کی قلب ماہیت نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ انتظار حسین کی داستانوی زبان کے بالمقابل ایک اچھوتی اور عصری زبان خلق کرنے کے امکانات

روشن کرتے جارہے ہیں، جس میں داستانوی زبان ہی کی طرح پھیلنے اور بڑھنے کی گنجائشیں بدرجۂ اتم ہوں۔ طلسم سامری کی جگہ اس میں حقیقت خیز قوت نمو ہو ظاہر ہے کہ الم ناک دور میں الف لیلوی زبان کے بالمقابل کربلا کی پیاسی زبان زیادہ معجز نمائی انجام دے سکتی ہے۔

(وہ) الف لیلیٰ کی کوئی کہانی سنا رہا ہوگا۔ کربلا کی پیاس بھلانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

(کالے لفظوں کا پل صراط)

اس طرح کی معجز نمائی، جو المیہ کے بطن سے پھوٹتی ہے' زبان کو اتنا لچکیلا بنا سکتی ہے کہ ہر چیز اس کی لپیٹ میں آجائے۔ ایسا لگتا ہے رشید امجد کی زبان اپنی جڑوں میں اتر کر بنیاد تلاش کر رہی ہو اور اپنے کھوکھلے پن کو تج کر پھر سے پھوٹ رہی ہو۔ یہ زبان براہ راست اور حقیقت خیز امیج کو محسوس پر منطبق کرتی ہے۔ رشید امجد کی نثر کے چند تخلیقی جملے اور محاورے:

' ڈاکٹر کی آنکھوں میں حیرت کی شمعیں پھڑ پھڑائیں'

پرانا جملہ ہوگا ۔۔۔ ڈاکٹر نے حیرت سے دیکھا۔

' گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے پھر ٹیڑھی دیواروں اور لمحہ بہ لمحہ سرکتی چھت کا خیال آیا'

پرانا محاورہ ہوگا۔ پیروں تلے زمین سرکتی نظر آئی۔

' اس کی بیوی نے بات کو سمیٹ کر نالی میں پھینک دیا اور بولی۔

دفتر کو دیر ہو رہی ہے'

پرانا محاورہ ہوگا۔ بیوی نے سنی ان سنی کر دی۔

ایسا نہیں کہ رشید امجد پرانے محاورے استعمال ہی نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ انھیں تخلیقی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر اوپر والے ایک محاورے کو اس طرح تحلیل کرتے ہیں۔

" اگر وہ دیواروں اور چھت کا ذکر کرتا ہے تو ان سنی کر کے بے شمار مسئلوں میں سے کسی کا ذکر چھیڑ دیتی ہے"۔

Scanned by CamScanner

کچھ اور جملوں میں محاوروں کا استعمال ۔

'اس نے سوچا' یہ لوگ ضرورت کی منہ زور چڑیلوں سے بھاگ کر شہر چھوڑ جاتے ہیں، باہر جاکر محنت کی چکیوں میں پستے ہیں اور پھر جب واپس آتے ہیں تو ان کے بٹوے پھولے ہوئے ہوتے ہیں'۔

' سورج کی کرنوں میں جوانی کا گرم خون دوڑنے لگا ہے ۔ وہ جسموں میں چٹکیاں لینے لگتی ہے'۔

افسانہ 'سیلہ جو تالاب میں ڈوب گیا' میں انھیں نے جو لفظ خودکشی 'کو فرسودہ اور کھوکھلا جان کر استعمال کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ اسے انھوں نے گھیر کر مرنے سے پہلے کا تجربہ' کہا ہے جس سے معنوی وسعت میں اضافہ ہوا ہے ۔ سارے افسانے کو اگر فرسودہ زبان میں لکھا جائے تو شاید افسانہ باقی نہ رہے ۔ اس طرح کی اچھوتی تشبیہات' نئے محاورے یا انوکھی تراکیب استعمال کرکے رشید امجد نے اپنے افسانوں میں جان ڈال دی ہے ۔ وہ خیالات اور امیجز کے ادغام سے علامتی زبان خلق کرتے ہیں ۔ مرئی اور غیر مرئی الفاظ کا سنٹیکس بناتے ہیں' اور جزو جزو علامتی اشاروں کے بل بوتے پر اس اس پوری علامت کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' جس کی طرف افسانہ لپکتا ہے ۔

رشید امجد کے یہاں جو کرافٹ مین شپ ہے' اس میں سورج اور سامنے کے منظر کی بنت ہے ۔ سوچ میں ماحول کی غیر مرئی خصوصیات اور تکلف کا ملا جلا سلسلہ ہوتا ہے ۔ منظر میں کانکریٹ امیجز ہوتی ہیں ۔ ایسا لگتا ہے جیسے سامنے کا گزرتا یا ٹھہرا ہوا منظر' سوچ کے لئے مواد کا کام دے رہا ہو' اور فن کار اسے تخلیق میں ڈھالتا چلا جارہا ہو۔

دوسری طرف کرافٹنگ کرنے میں بات سے بات کے بجائے زیادہ تر بات سے سوچ نکلتی ہے' اور سوچ سے احساسات کی رو جو صورت حال کو تخلیقی طور پر سامنے لاتی ہے ۔ عام گفتگو میں کوئی شخص اگر بات کرتے کرتے یکایک چپ ہو جائے تو دوسرے سننے والوں کے ہاتھ چند کہی ہوئی باتوں کے سوا کچھ نہ آئے گا ۔ ہاں چپ کے دوران سوچ کا جو تسلسل بنا رہتا ہے اگر فن کار الفاظ میں اس کا احاطہ کرے تو اس طرح دو باتوں کے درمیان والی خاموشی کے زمانی خلا کا احتساب بھی ہو جائے گا اور سوچ کا وقفہ کرافٹ بھی ہو جائے گا ۔ اس تکنیک سے صورت حال میں ابھار پیدا ہوتا ہے اور علامتی کیفیت

جو فن کار پیش کرنا چاہتا ہے، اس پر گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ رشید امجد کے یہاں اسی دھوپ چھاؤں کی کیفیت میں سوچ اور احساسات نئی نئی سمتوں میں لپکتے ہیں اور افسانے کے علامتی کل کو لپیٹ میں لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر افسانہ 'سہ پہر کی خزاں' ہے، جس میں موجودہ سے ماضی کی طرف لوٹ جانے کے عمل میں جو سوچ ابھرتی ہے، کچھ ایسی ہی ہے۔ راوی باتیں کرتے کرتے اچانک ماضی میں غرق ہو جاتا ہے، پھر ہوش اسی وقت آتا ہے جب ملازم وارد ہو کر سکوت توڑ دیتا ہے۔

'بیگم صاحبہ کھانے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔'

یہ جملہ اسے پھر استغراق کے عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ جملہ کے ردِ عمل سے صورت حال کے ادراک میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے رشید امجد کے یہاں ماضی کے استغراق اور بیوی کے ردِ عمل میں فرد کی شناخت کا مسئلہ مناسب ترین معنویت کے ساتھ کرافٹ کیا جاتا ہے۔

"نمبر۔" بوڑھے اکاؤنٹنٹ نے عینک کے دھندلے شیشوں میں سے اسے گھورا۔

"ETE-23704"

اکاؤنٹنٹ نے پے رول پر نشان لگایا اور تنخواہ کا ٹوکن اس کی طرف لڑھکا دیا۔ نوٹ گنتے ہوئے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لین دین کے پورے صفحے کو جلدی جلدی جمع تفریق کیا اور دس دس کے دو نوٹ نکال کر پتلون کی پچھلی جیب میں رکھ لئے۔ "تو آج تمھیں تنخواہ ملی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں۔ اور بڑی مشکل سے بیس روپے بچا سکا ہوں۔"

'تم بیوقوفی کی حد تک صاف گو ہو'۔ وہ آہستہ سے بولی۔

'یہ اچھی بات نہیں۔'

یہ حصہ افسانے میں الگ سے کرافٹ کیا گیا ہے۔ سوچ کا یہ ٹکڑا افسانے کی تقسیم سے الگ نہیں۔ افسانے کے اس طرح کے PASSAGES کے درمیان خطِ فاصل کھینچا جا سکتا ہے جو لمحۂ گزراں کے ساتھ بدلتے ہوئے احساسات اور ردِ عمل کو الگ کرتے ہیں یا

ماضی اور یادوں کو سوچ کی مختلف پرتوں میں اتارتے ہیں۔ میرا خیال ہے ان افسانوں میں شعری STANZAZ کی کرافٹ البتہ افسانے کو افسانے سے دور کرتی ہے۔

رشید امجد کے اظہار کا ایک خاص آلۂ کار مکالمہ ہے۔ میرا خیال ہے مکالمے یہاں دوہرے کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استغراق کے عالم میں بھی مکالمے ابھرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں توجہ کے لائق افسانہ 'نارسائی کی مٹھیوں میں' ہے جس میں پس منظر بدلتا ہے، مختلف کردار آآ کر مکالموں سے جڑتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں مگر مکالموں کا فکری تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ مکالموں سے ہی تفاعل کراتا ہو۔ بدلتے ہوئے ماحول اور بدلتی ہوئی سوچ کا تصادم مکالموں سے ہوتا ہے جو عموماً حقیقی اور ٹھوس ہوتے ہیں جس کی وجہ سے حقیقت اور خواب آپس میں گتھے نظر آتے ہیں۔

مکالموں کی شکل کبھی داخلی ہوتی ہے کبھی خارجی۔ اسی طرح جیسے مناظر کی حیثیت کبھی خارجی کبھی داخلی ہوتی ہے۔ جب مکالموں کی صورت خارجی ہوتی ہے تو ان کی خارجیت صاف پہچانی جا سکتی ہے۔ انھیں کی راہ سے فن کار اور قاری دونوں خارجی دنیا سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ خارجی مکالموں کا رویہ کچھ اس طرح نظر آتا ہے جیسے کوئی شخص پانی میں غوطہ لگانے کے بعد سطح پر ابھرے، ہوا میں سانس لے، ایک نظر باہر ڈالے، پھر ڈبکی لگا دے۔

داخلی حیثیت سے مکالموں کی تین صورتیں ہیں۔ ایک وہ جب کہ وہ اپنی صحیح شکل میں یاد آتے ہیں۔ ایک وہ جو داخلی تخلیقی تفاعل کے باعث ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور اپنی شکل بگاڑ لیتے ہیں۔ تیسری شکل یہ ہے کہ مکالمے نہ باہر سے امپورٹ ہوتے ہیں' نہ یادوں کے ذریعہ وابستہ ہوتے ہیں، بلکہ داخل میں اپنے آپ بن جاتے ہیں۔ ایسے مکالموں سے رشید امجد صورت حال کا گہرا عکس منقش کرتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ رشید امجد جیسا فنکار اپنا قاری آپ پیدا کرنے کی راہ اپناتا ہے۔ یہ کرمی منزل یقیناً حالی کے دور سے آگے کی منزل ہے۔ حالی کے 'جمہور' اور آج کے قارئین میں فرق یہ ہے کہ حالی 'جمہور کا دل' جوں کا توں قائم رکھتے ہیں، اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں نکالتے۔ کیا 'جمہور کا دل' نئے آہنگ کے اعتبار سے بدلتا نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عصر حاضر کا فنکار نیا 'جمہوری' رابطہ خلق کرنا چاہتا ہے۔ یہی وہ میدان ہے جہاں قدیم ڈھانچے نئی لسانی تخلیقات سے مات کھا سکتے ہیں۔ □

ڈاکٹر ایوب مرزا
۱۵۔بی، ہارلے اسٹریٹ
راولپنڈی، پاکستان

رشید امجد شخص سے افسانہ نگار تک

راستہ چلتے دائیں بائیں ڈولتے ہوئے رشید امجد کو دیکھ کر بری طرح پٹے ہوئے کسی کنفیوز شاعر کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن شاعری اس کے قریب سے نہیں گزری۔ افسانہ اس کی رگ رگ میں رچا ہوا ہے۔ جوانی کی دہلیز پار کر چکنے کے بعد بھی ہمہ وقت افسانے میں نئی تانیں اڑاتا اور انوکھے رنگ بھرتا رہتا ہے۔

لیکن اس کے والد بزرگوار جناب مونس نقشی باقاعدہ شاعر اور صاحب سخن تھے۔ پابند شاعری کے اسیر مونس نقشی سری نگر شہر کے باسی روزی کمانے کے لئے قالین بافی کرتے تھے، اور دولت اڑانے کے لئے شاعری کی بنت میں پروئے ہوئے تھے۔ دونوں میں مشاق تھے۔ خوشحالی قالین کے ساتھ گھر میں وارد ہو چکی ہوئی تھی۔ اور شاعری کوشش بسیار کے باوجود ان کے گھر میں فاقہ اور غربت کو جنم نہ دے سکی تھی۔ ایسی ریل پیل اور لطیف سہانی فضا میں رشید امجد رینگتے رینگتے چلنے لگا۔ اور نقشی صاحب نے اپنے نقشِ دل کو ریاست کے سب سے مہنگے اور اونچی نسل کے سکول برنز ہال (BURNS HALL) میں داخل کرا دیا۔ امرا اور رؤسا کے لئے یہاں خالص ولایتی سماں تھا۔ دیسی بچے دھیرے دھیرے ماں بولی اور کشمیری اور اردو زبان سے دور ہوتے جاتے اور سرعت کے ساتھ انگریزی کے گرداب میں ہاتھ پاؤں مارتے ڈوب جاتے۔ سری نگر کے خوبصورت علاقہ ایراکدل کی دلفریب فضا میں اس سکول کی امیرانہ ہوا غریب کی اولاد کے پھیپھڑوں کے لئے دق تھی۔ ایسی امیرانہ فضا و ہوا میں رشید امجد بھی بھر کھلے انگلش ساز لیتا اور انگریزی کے فراٹے بھرتا۔ وہ خوشی میں پھولا نہ سماتا تھا۔ نیکر پہنے لمبی لمبی ٹانگوں اور ذہین نظروں والا یہ بردا کبھی کبھی سکول کے ڈائننگ میز سے غیر حاضر نہ ہوا تھا۔ اسے لذیذ لنچ بے حد عزیز تھا۔ دو برس میں اس کا انگ انگ انگریزی رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ اسے درنیکلر کا ایک لفظ تک یاد نہ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج رشید امجد انگریزی کی پرواہ نہیں کرتا اس وقت اسے اردو کی سدھ بدھ تھی نہ پرواہ!

پوچھا رشید امجد تم پنڈی کب اور کیسے پہنچے ؟ ــــ بولا ــ ڈاکٹر صاحب میں ــــ پاس کر چکا تھا۔ یہی ۱۹۴۷ء کے ستمبر کا کوئی دن تھا۔ والد صاحب کو راولپنڈی میں آباد بہن کی یاد نے ستایا۔ بولے پنڈی جانا ہے۔ امی جی بہ جبیں ہوئیں۔ بولیں لو سنو یہ چلے پنڈی ! مگر ڈاکٹر صاحب وہ بھی سیر کی رسیا تھیں۔ وقفہ کے بعد کہنے لگیں 'کب چلو گے ؟' یوں ماں جی کو راضی برضا پاکر والد محترم نے سفر کے لئے کمر باندھ لی۔ کہا رشید امجد ہمارے پسماندہ مشرقی معاشرے میں بہنوں کا مان بھائیوں ہی سے ہوتا ہے۔ بولا وہ تو ٹھیک ہے۔ خیر والد صاحب نے فی الفور پچاس قالینوں کا ایک ہی بنڈل باندھا۔ امی جی نے پوچھا یہ کیا ہے ؟ بولے یہ بنڈل ہے۔ اس میں قالین ہیں۔ پوچھا وہ کس لئے ؟ بیچنے کے لئے ! امی نے والد محترم کو خشمگیں نظروں سے گھورا۔ والد محترم نے امی پر سے نظریں ہٹا کر بنڈل پر گاڑ دیں۔ دھیمے لہجے میں بولے نیک بخت خرچہ نکل آئے گا۔ برہم اماں جی چیخیں وہاں کونسا تمہارا ــــ گاہک بیٹھا ہوا ہے۔ حالات دیکھو ! ہائے اس مرد کی عقل پر تو پردہ پڑ گیا ہے۔ ایسے میں ان کو کون خریدے گا ؟ الٹا ان پر بھاٹا اٹھے گا۔ نہیں یہ قالین نہیں جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب ابو امی جی کی برہمی کی ویسے بھی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ بنڈل کو ایک کونے میں رکھا۔ اس پر پردہ ڈالا اور امی جی میری ایک بہن اور مجھے ساتھ لے کر یوں پنڈی پہنچے ــــ پھر ؟؟

پھر یہی کوئی دن گزرے ہوں گے۔ راولپنڈی میں قبائلی آ گئے (اپنی ہیئت گذائی سے یہ مخلوق خدا خاصی خوفناک لگتی تھی۔) ادھر کشمیر میں دمادم مست قلندر ! میرا مطلب ہے جنگ چھڑ گئی اور کشمیر جانے کے راستے میں بارڈر آگ آیا۔ دونوں اطراف سے دنادن توپیں چل رہی تھیں اور گولیاں برس رہی تھیں۔ ماں برستیں۔ یہ کون سا وقت تھا بہن کو ملنے کا اور اپنوں سے بچھڑنے کا ؟ ڈاکٹر صاحب یوں سمجھئے ہم پھوپھی جان کے ہاں پھنس کر رہ گئے جیسے سیلابی پانی کے ریلے میں ہچکولے کھاتا بکھرا ہوا گھونسلا کنارے کی کسی جھاڑی میں پھنس جائے۔

دن گزرتے گئے۔ رقم ختم ہوتی گئی۔ پھوپھی تنگ آ گئی اور کشمیر مسئلہ کشمیر بنتا گیا۔ ہم سب سیاست کے انجانے کھیل میں الجھ گئے۔ امی جی والد محترم کو تنہا پا کر برہم ہوتیں چیختیں۔ ائے اس مرد کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ ہائے وہ بنڈل ہی اٹھا لایا ہوتا۔ آج کام آتا۔ امی جی کی حیرانی سے پھوٹی کھلی پھٹی آنکھیں دیکھ کر والد محترم اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔ نرم لہجے میں بولتے۔ نیک بخت بنڈل پر پردہ ڈال کے آیا ہوں۔ اسے چور نہیں لے جائیں گے۔ ہمیں یہاں بیٹھے

تو نہیں رہنا ہے نا! راستہ کھلنے کی دیر ہے۔ بس چلتے ہیں۔ ذرا صبر کرو! دراصل دونوں نہیں جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے؟ جو ہوا اس کے لئے وہ تیار نہ تھے اور صبر کی حدوں سے وہ بے خبر تھے۔ وہ بے کنار تھیں۔ ماں پوچھتیں وہ کیسے کھلے گا؟ اُدھر بھارت اِدھر پاکستان۔ کیسے کھلے گا یہ راستہ؟ کون کھولے گا؟ والد محترم بولتے۔ بی بی بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیری بھی تو ہیں۔ (چکی کے دو پاٹوں کے درمیان)۔ راستہ کون بند کر سکتا ہے؟ اور دونوں اس کون سے ناآشنا تھے۔ ماں کو خوش دیکھ کر والد صاحب چپکے چپکے دلاسہ دیتے۔ بی بی بھرا گھر چھوڑ کر صرف ملنے آئے ہیں۔ ہمیں یہاں ٹکنا نہیں ہے۔ یہ تو عارضی فساد ہے۔ راستے کبھی کبھی بند ہوتے ہیں؟ بارڈر کیا چیز ہے؟ اسے کون بند کر سکتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب! پھر راستوں پر ننگی سنگینوں کے پہرے بٹھا دیئے گئے۔ راستہ بند ہو گیا۔ پونجی ختم ہونے کو آئی۔ پھوپھی جان سے بیچ بیچ بڑھی تو اماں جی بولیں۔ نیک بخت یہیں کچھ کام وام کر لو۔ روٹی کا بندوبست ازبس ضروری ہے۔ گمبھیر آواز جس میں گہرا تیقن تھا بولے۔ بی بی مجھے قالین بافی آتی ہے۔ مگر یہ شہر تانگہ بانوں کا شہر ہے۔ مجھے تانگہ چلانا نہیں آتا۔ تانگہ گیری میری جبلت میں نہیں ہے۔ اس میں شاعری ہے۔ میں شعر کہتا ہوں۔ یہاں میرے شعر کون سنے گا؟ یہاں ویسے بھی شاعروں کی بھرمار ہے۔ یہاں تانگہ چلتا ہے اور لوگ موزونیت کا لبادہ اوڑھے خراماں خراماں گھوم رہے ہیں۔

جی جناب! پریشانی میں کمی کہاں سے آتی؟ بلکہ مزید اضافہ ہوا تو ماں بولیں کوئی کلیم ولیم داخل کر، کوئی الاٹمنٹ کروا۔ اب پھر سے گھر بسا۔ زندہ رہنا ہے کہ نہیں؟ غضب الٰہی کے بخار میں تپتے ہوئے مفلوک الحال نقشی صاحب نے کوئی الاٹمنٹ نہ کروائی۔ کوئی کلیم داخل نہیں کروایا۔ ان کا ایک ہی کلیم تھا۔ راستہ کھولو، اور ایک ہی رٹ تھی راستہ کیسے بند ہو سکتا ہے؟ دروازہ کھولتے ہوئے بولتے۔ غور سے دیکھو۔ دروازے کھلنے کے لئے ہوتے ہیں۔ راہ چلنے کے لئے ہوتی ہے۔ راستہ آنے جانے کے لئے ہوتا ہے۔ راستہ کھلتے ہی ہم سب پلک جھپکنے میں سری نگر ہوں گے۔ رشید امیرا کدل یرنز ہال میں ہوگا۔ بس تھوڑا سا صبر کرو۔ راستہ کھل جانے دو۔ ڈاکٹر صاحب! راستہ کھولنے کا نسخہ، ترکیب یا سکت ہمارے والد محترم کے بس میں نہ تھی اور راولپنڈی میں قیام غیر یقینی طوالت سے بوجھل ہونا شروع ہو گیا۔ فاقوں کی سرحدیں قریب آگئی تھیں۔ نہ کام نہ دھندا، بند راستہ سب کے گلے کا پھندا!

بھائی صاحب! آپ پر واری واری جاؤں۔ جان ہزار بار صدقے کر دوں۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے۔ میں بال بچہ دار ہوں۔ میرا سسرال ہے۔ اب آپ اپنا راستہ لیں۔ کہیں گھر بنائیں۔ اپنے بیوی بچوں کو سنبھالیں۔
ایک روز بہن کی یہ باتیں سن کر نقشی صاحب کا دل و دماغ سن ہو گیا۔ انھیں پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ اس تمام کھن گرج میں وہ ایسے ہی تنہا کھڑے راستہ تلاش کر رہے ہیں جیسے حضرت آدم روزِ اوّل کرۂ ارض پر۔

ادھر رشید امجد نانک پورہ کے پچھواڑے لٹی کے گندے نالے پر ڈل جھیل اور امیرا کدل میں برنز ہال اسکول کو یاد کرتا رہا۔ وہ ہمجولیوں میں اَن فٹ تھا۔ اس کی انگلش گٹ پٹ ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اور اسے ان کی بامحاورہ پھوہاری پنجابی مغلظات پلے نہ پڑتی تھیں۔ وہ اپنی ہی گلی میں غریب الدیار گلہری کی طرح اجنبی تھا۔

مزید تذبذب کی تاب نہ لاتے ہوئے رشید امجد کو محلے کے ایک پرائیوٹ سکول میں بٹھا دیا گیا۔ تعلیمی ماحول مخلوط تھا۔ جماعت چہارم کے بعد لڑکوں کو فارغ کر دیا جاتا تھا۔ ہیڈ مسٹرس بے اولاد تھی۔ اسے سُرخ گالوں والا انگریزی شائستگی سے مرصع کومل نرمل رشید امجد ملا تو بھا گیا۔ وہ اسے بیٹے کی طرح چاہنے لگی۔ لڑکیاں اسے اپنے ہی جیسا جانتی تھیں۔ اس کا دل لگ گیا۔ اور ہیڈ مسٹرس نے اسے چار کی بجائے سات سال تک اپنے پاس رکھا۔

ادھر مونس نقشی ماؤف دماغ اور آزردہ دل لیے شعر کہتے اور خود ہی سر دھنتے تھے۔ بے بسی کے اس عالم میں یاروں نے مشورہ دیا نقشی بھائی راستہ کھلے گا جب دیکھا جائے گا۔ سردست کچھ ٹھکانہ کر لو۔ بہن کے گھر کب تک پڑے رہو گے۔ حکومت مظفر آباد میں قالین بافی کا کارخانہ لگا رہی ہے۔ نظرِ انتخاب آپ پر ہے۔ جائیے اسے سنبھالیے۔ نیم فاقہ زدہ نڈھال نقشی کے لیے روزگار کا دروازہ کھل رہا تھا۔ چہرے پر روشن کرن لیے بیوی سے بولے۔ نیک بخت دیکھ مظفر آباد تک کا راستہ تو کھلا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب وہ منیجر ہو کر مظفر آباد یہ کارخانہ چلانے چلے گئے۔

اور جناب اب جنگ بند ہو چکی تھی۔ بارڈر کے دونوں اطراف بھارتی اور پاکستانی سنگینیں لشکارے مار رہی تھیں۔ بارڈر کے اُدھر کے کشمیری اور اِدھر کے کشمیری یو۔ این۔ او۔ کی طرف دیکھ رہے تھے اور یو۔ این۔ او۔ امریکہ میں میکارتھی ازم کے سیاہ سائے میں گھری

ہوئی برلن، کوریا اور ویت نام میں ایک نئے بھیانک کھیل کی لمبی بساط کو جانچ رہی تھی۔ کشمیر میں یو۔این۔او۔ کے دستے آچکے تھے کہ راستہ کھلنے نہ پائے۔ کشمیریوں پر کشمیر کے تمام راستے بند تھے۔ مگر ادھر کے سانپ ادھر کی بانبی میں بے خطر چلے جاتے اور اُدھر کے کتے بھونکتے بھونکتے ادھر کے اجڑے دیہاتوں کی ویران گلیوں میں روٹی کے ٹکڑے تلاش کرتے پھرتے۔ یہ آزاد تھے، اور بوڑے الفتِ انسان دونوں جانب مقید اور پابجولاں تھی ــــ پھر؟؟

پھر قالین بافی کی فیکٹری مکمل طور پر فیل ہوگئی۔ رزق کی جستجو میں لاہور، پشاور میں دھکّے کھاتے کھاتے اور پشاور روڈ کی فیکٹریوں کی خاک چھانتے چھانتے نقشی صاحب کے چہرے کے خوبصورت کشمیری نقش راولپنڈی کے تانگہ بانوں کے چہروں کی گہری کھائیاں بن گئے۔ جھرّیوں کے بوجھ سے ان کے ٹخنوں میں درد اٹھا تو پاؤں میں سوجن نے جنم لیا۔ چلنا پھرنا دوبھر ہوا اور مونس صاحب بے مونس و غم خوار کھاٹ سے لگ گئے۔ رشید امجد باپ کی کھاٹ کے پائے کے پاس پہروں کھڑا انھیں بغور دیکھتا رہتا مگر کچھ نہ بولتا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ گنگا جمنا اور وادیٔ سندھ کی تہذیبوں کے سنگم پر رشید امجد کے پاس اپنے مجبور باپ کی تنہائی کا کوئی مداوا نہ تھا۔

اس کے سامنے باپ کی آنکھیں بند ہو رہی تھی۔ وہ گھر کے بند دروازے کو گھورتا، بڑبڑاتا 'راستہ کون بند کرسکتا ہے ؟' مونس نقشی نے آخری ہچکی لی۔ اس کی روح قفس عنصری کا گیٹ کھول کر پرواز کرگئی۔ اور یوں شیتل نرمل کومل رشید امجد کے لئے جو کبھی چنچل تھا یتیمی کا نزول ہوا ـــــ پھر ؟؟

پھر میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب ڈینیز ہائی اسکول میں تھا۔ ماں مجھے پھول کی مانند رکھتی تھی۔ دھوپ میں باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔ اور جناب اگر میں غسل خانے میں ذرا دیر لگاتا تو وہ فوراً دروازے کے پٹ کھول دیتی۔ اسے بند کواڑ بہت برے لگتے تھے۔ میری ماں نے بہت محنت کی۔ اس نے گھر میں ہر فالتو اور فاضل چیز کو قربان کردیا اور پھر آخر میں غربت سے اس غیر منصفانہ جنگ میں اس نے اپنا زیور بھی بیچ ڈالا۔ وہ یقین محکم کا پیکر تھی۔ اس نے بچوں کو پالنے میں مثالی مشقت کی ہے۔ مجھے دکھ ہے میں اس کے کام نہ آسکا۔ اسے سکھ نہ پہنچا سکا ـــــ پھر ؟؟

پھر جناب میں نے دسویں پاس کر لی۔ میری آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں اور میں فری

تھنکنگ کے آزار میں گھر گیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب فری تھنکنگ کا چرچا تھا۔ اور میرا مطلب ہے ذرا سا فیشن بھی تھا۔ جو جی چاہے سوچو، جو جی چاہے بولو جو جی چاہے کرو۔ روک ٹوک سے، میرا مطلب ہے قدغن سے پاک فضا جس میں مساویانہ رویۂ حیات اور فطرت پنپ سکے! ـــ یوں رشید امجد فری تھنکنگ کے آزار میں مبتلا ہو گیا۔ اس عشق میں وہ ناہلی کی طرح لمبا ہوتا گیا لیکن پھل نہ سکا۔ زینہ زینہ وہ زمانے کے لمحات کی کڑیوں میں جکڑتا گیا۔

ایسے ہی ایک لمحہ کی بات ہے جب الھڑ البیلے گبرو رشید امجد کے سر پر سیاہ بالوں کی بودی قائم تھی۔ وہ دسویں پاس کر کے کالج میں داخلہ لینے پہنچا۔ جیب داخلہ کی فیس کے روپوں سے بھاری تھی۔ کشمیری بوجھ اٹھانے کے اہل ہیں۔ بوجھ اٹھانا گرچہ ان کے لئے نوشتۂ تقدیر بن چکا ہے لیکن وہ اسے دل سے پسند نہیں کرتے لہٰذا بوجھ اتار کر جب وہ سسکارتے ہیں تو ان کے پھولے ہوئے نتھنوں سے مست مور کے پائل پروں کی جھنکار سے نکلتی ہوئی شوشنکار کی طرح پسینے اور رطوبت میں رچی سانس کی خوشبو اردگرد پھیلتی ہوئی صاف محسوس ہوتی ہے۔

رشید امجد اپنی بوجھل جیب کا بوجھ زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکا۔ کالج کیشئر کے دفتر کی کھڑکی دھندلا گئی ـــ اسے وہ نظر ہی نہیں آتی۔ کالج کے سامنے کیفیٹریا کا دروازہ دکھلائی دیا۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے سے اس نے سالم مرغ روسٹ کا پہلی بار آرڈر دیا۔ جیب کو ٹٹولا۔ نوٹ موجود تھے۔ ان کے انوکھے لمس سے سرشار اس نے مسکراتے ہوئے کوک کا آرڈر بھی دے دیا۔ یہیں سے اس کی فری تھنکنگ کا آغاز ہوا۔ روسٹ مرغ کھانے کے بعد اس روز رشید امجد نے بیرے کو بہت پتے کی باتیں بتائیں اور عجیب عجیب نکتے سمجھائے۔ بولا میرے بھائی بیرے میں دس پاس ہوں۔ علم روشنی ہے۔ علم بڑی چیز ہے۔ یہ انسانیت کا زیور ہے۔ پھر اٹھتے ہوئے اس نے بیرے کے صافی والے کندھے کو چھوا۔ دھیرے سے بولا غربت اندھیرا ہے۔ بہت بڑا اور گہرا اندھیرا ہے۔ یوں گورے چٹے ان پڑھ بیرے کو زیورِ علم سے آراستہ ہونے کا درس دے کر کوک کا آخری گھونٹ پی کر وہ کیفیٹریا سے باہر نکلا۔ اسے آج باہر کی فضا میں ہوا بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ سامنے کالج سے ملحقہ اونچی عمارت دیکھ کر بولا 'سارے لوٹرز (LOOTERS) ـــ استحصال پسندوں کا حرامکار ٹولہ!

اب یہ روز کا وطیرہ تھا۔ ایک روز چکن تکہ کی ٹانگ چیرتے ہوئے اس نے بیرے کو بتایا یہ ہوٹل والا اس کا استحصال کرتا ہے۔ جب بیرے نے کہا باؤ جی وہ میرے ساتھ

کچھ بھی نہیں کرتا تو رشید امجد نے اسے سمجھایا کہ وہ اس کی محنت کا پھل کھاتا ہے اور موٹا ہوتا جاتا ہے اور یوں اس کا استحصال کرتا ہے۔ بیرہ اکثر بیروں کی طرح اس کا منہ دیکھتا رہتا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھا کہ وہ ہوٹل کے مالک سے اب استحصال نہیں کروائے گا۔ بولا باؤجی تسی بڑے چنگے ہو۔

کچھ روز مزید فری تھنکنگ کا سلسلہ چلتا رہا اور رشید امجد کی جیب کا بوجھ ہلکا ہوتا رہا اور پھر وہ ہلکی ہو گئی ـــ خالی ہو گئی۔ یوں ہلکی جیب اور خالی ہاتھ اسے کالج یاد آیا۔ کھڑکی سے کیشئر نے کہا بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ داخلہ بند ہو چکا ہے۔ رشید امجد کھلے آؤٹ گیٹ سے بنا علم کی روشنی لئے کالج سے باہر نکل آیا۔

فری تھنکنگ کی مشک کا مشکیزہ اٹھائے خالی نرم ہاتھوں کا مال بیچنے وہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے دفتر پہنچا اور اوورسیئر منشایاد کا درک مستری ہو گیا۔ شام کو کام کا حساب دیتے ہوئے اسے خدا یاد آتا۔ فری تھنکنگ کام آ چکی تھی۔ تھکے ہارے رشید امجد کے سر کے بال موسمی یاروں کی طرح اڑنا شروع ہو گئے۔ بودی پتلی ہو چکی تھی۔ مٹی میں آٹی بودی کو لئے وہ ایک روز کیفیٹریا پہنچا۔ بیرا لپک کر آیا۔ بولا باؤجی کتھے ہو۔ رشید امجد کی سٹی گم تھی۔ ایک مدد کارک چائے کا آرڈر دیا اور چپ چاپ چائے پی کر بغیر ٹپ دیئے اٹھا۔ بیرے سے ہم کلام ہوئے بغیر باہر نکلا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی گھائل ہو گیا ہے۔ بیرا بھاگتا ہوا اس کے پیچھے باہر تک آیا۔ جیجا باؤجی مینوں رب دی قسم میں بخشش نہیں مانگتا۔ میں آپ کا استحصال نہیں کروں گا۔ آپ روز آیا کریں۔ میں چائے پلاؤں گا۔ میں تو روزانہ آپ کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ آپ بڑی اچھی اور بہت پتے کی باتیں کرتے ہیں۔ جب رات کو اپنے دوستوں کو یہی باتیں بتاتا ہوں تو وہ حیران ہوتے ہیں مجھے عقل مند سمجھتے ہیں۔ مگر باؤجی میں جانتا ہوں عقلمند کون ہے؟ آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا؟ آپ آتے کیوں نہیں۔ رشید امجد رکا۔ پل بھر کو سانس روک کر بولا۔ یار صاف بات یہ ہے۔ میرا مطلب ہے تم تو جانتے ہو، تم تو سب کچھ سمجھتے ہونا! میرے یار وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ میرا مطلب ہے وقت ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ میرا وقت بدل گیا ہے۔ اب پھر بدلے گا تو ضرور آیا کروں گا۔ رشید امجد نے اپنی خالی جیب کو ٹٹولا۔ بولا یار صاف بات یہ ہے علم بڑی شے ہے۔ یہ بہت بڑی دولت ہے۔ بیرہ نے لقمہ دیا۔ یہ روشنی ہے اور غربت اندھیرا ہے۔ بہت بڑا گہرا اندھیرا۔ باؤجی مجھے سب یاد ہے۔ رشید امجد

ہلکا ہو چکا تھا۔ اس نے بیرے کے صافی والے کندھے کو تھپکی دی اور چل دیا۔ بیرے نے جلتے ہوئے رشید امجد کو پکارا۔ باؤ جی ہمارا وقت کب بدلے گا؟ لیکن وہ گردن گرائے ڈولتا ہوا کالج کے گیٹ کے سامنے سے خاموش گزر گیا۔

رشید امجد کی سسکار چپ ہو چکی تھی اور وہ مور کے پائل پروں کی بجھتی ہوئی شوشنکار کی مانند چارپائی پر پڑا اندھیری رات میں تاروں کو گن رہا تھا۔

کمال بات ہے رشید امجد! احساس محرومی تو جذبۂ تجسس کو جنم دیتا ہے۔ آپ کس طرف نکل گئے؟ بس ڈاکٹر صاحب اس کے بعد نو برس تک ورک مستری اور پھر جونیئر کلرک رہا۔ پنڈی کی ورک شاپ ۵۰۱ میں بھی رہا۔ پھر ایک روز ان لٹے ہوئے نو برس کی تلخیٔ ایام نے جھنجھوڑا اور یاد دلایا کہ ماں نے بڑی مشقت کی ہے۔ اور غربت نے بڑا عفریت پیدا نہیں ہوا۔ خیال آیا علم بڑی شے ہے ــــ پھر؟؟

پھر جناب ڈاکٹر صاحب میں نے ادیب فاضل پاس کر لیا۔ میرے لیے راستہ کھل گیا۔ ایف۔اے۔ ہوا، بی۔اے۔ ہوا۔ اب رشید امجد انگریزی کے بھنور سے نکل چکا تھا۔ اردو فر فر بولتا اور پھوٹوہاری پنجابی کی فصیح زبان پر اپنی دسترس سے دنگ کر دیتا۔ وہ نشیب و فراز سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اور جب اس نے گارڈن کالج میں ایم۔اے۔ اردو کی کلاس میں داخلہ لیا تو یہ انگریزی کا پاسٹ ٹنس بن چکا تھا۔ اب اسے انگریزی کا کوئی قاعدہ قانون یاد نہ تھا۔ اس کی نیکر اتر چکی تھی اور یہ ورنیکلر میں رنگا جا چکا تھا۔

اس کے ہم جماعت سلطان رشک اور جاوید حکیم قریشی جیسے لائق، زیرک اور جہاندیدہ لوگ تھے اور مقابلہ میں لاہور سے انور سدید، امجد اسلام امجد اور اسلام آباد سے منشا یاد جیسے چیدہ حضرات تھے۔ پوچھا کون سی ڈویژن آئی تھی۔ آنکھوں میں جھینپتی چمک کے ساتھ بولے۔ اوّل تھی۔ ڈاکٹر صاحب کیا عرض کروں۔ بس گولڈ میڈل ہاتھ چھوتا ہوا نکل گیا۔ انور سدید اوّل آئے تھے۔ گولڈ میڈل انھیں کے حصہ میں آیا۔ ورنہ ہم بھی آج پروفیسر فتح محمد ملک کی طرح گولڈ میڈلسٹ ہوتے! ــــ پھر؟؟

پھر کیا پوچھتے ہیں! جناب ہم لیکچرار بھرتی ہو گئے۔ سی۔بی۔ کالج واہ میں! وہ دن میری خوشی کی انتہا کا دن تھا۔ ہم قدرے آسودہ حال ہوئے تو والد محترم مجھے بہت یاد آئے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کی روح کی آواز میرے بند دروازے کے پیچھے سے آتی ہے۔ بہت دیر کی

مہرباں آتے آتے ۔ والد محترم کی موت میری زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے ۔ میں اپنے والد کے لئے خوشی کی کرن بن کر نہ پھوٹ سکا ۔ اور وہ ہم سب سے ، حالات سے روٹھ کر بے خبری میں گزر گئے ۔

جناب میں میں ہی ہوں ۔ میرا مطلب ہے میں ہی رشید امجد ہوں ۔ منکہ رشید امجد ! ایک غریب الدیار کشمیری ! بچپن میں سری نگر سے راولپنڈی آیا تھا ۔ حال سکنہ نانک پورہ ہوں ! کیا فرمایا آپ نے ؟ خوش ہوں ؟ جی بہت ! — جی اپنی حالت بیان کروں ؟ جناب کیسا بیان کروں ۔ میرا مطلب ہے کیسے بیان کروں ؟ تو جناب حالت خراب ہے — نہیں نہیں میرا مطلب ہے شاید حالت خراب نہیں ہے ۔ سب اچھا ہے اور میں مظلوم کشمیری ہوں شاید میں مظلوم کشمیری نہیں ہوں یا شاید میں مظلوم ہوں اور کشمیری نہیں ہوں یا پھر میں کشمیری ہوں اور مظلوم نہیں ہوں ۔ جناب والا کوئی کشمیری مسکین نہیں ہوتا ۔ وہ صاحب دل و جگر ہوتا ہے اور جب دل دکھتا ہے تو وہ رونے لگتا ہے ۔ نہیں جناب میں رو تو نہیں رہا یا شاید میں رو ہی رہا ہوں ۔ یہ پانی کے قطرے جو میرے زرد گالوں پر لڑھک رہے ہیں میری تقدیر کے پسینے کے موتی نہیں ہیں ، یہ تو میرے آنسو ہیں ۔ نہیں نہیں یہ کچھ بھی نہیں ۔ یہ موتی نہیں ہیں ۔ یہ آنسو بھی نہیں ہیں ۔ یہ تو ویسے ہی ہیں جیسے خواب میں بھیگے بدن پر بارش کی بوندیں گری ہوں ۔

لاحول ولاقوۃ ! جناب آپ مذاق فرما رہے ہیں ۔ حاشا وکلا میں اشتراکی نہیں ہوں ۔ میں ہرگز نہیں ہوں ۔ جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یا پھر آپ کو غلط فہمی نہیں ہوئی ہے ۔ میرے اوپر ابھی چودہ طبق روشن نہیں ہوئے ہیں یا شاید پھر ہو چکے ہیں اور مجھے خبر نہیں ہوئی ۔ مینی فیسٹو ؟ جناب کیسا مینی فیسٹو ! ہم لوگ بغیر مینی فیسٹو قدم ملا کر علت لئے گھوم رہے ہیں ۔ حضور میں ترقی پسند بھی نہیں ہوں ۔ لیکن ٹھہریئے جناب یہ تو فرمایئے ترقی کے بغیر دنیا کیسے قائم ہے ؟ انسان کیسے زندہ رہ سکتا ہے یا شاید انسان ترقی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے ۔ ترقی کسے پسند نہیں ہے ؟ مجھے بھی پسند ہے ۔ نہ جانے میری ترقی کیوں رکی ہوئی ہے ۔ مجھے تو اسلام آباد میں پلاٹ بھی نہیں ملا ۔ میں بھی افسانہ نگار ہوں یا شاید میں بھی افسانہ نگار نہیں ہوں ۔

یہ درست ہے جناب ! آپ بجا فرماتے ہیں ۔ دیگر بے شمار دانشوروں اور اساتذہ کی طرح میں بھی نمک اپنے دیس کا کھاتا ہوں ۔ ویسے بھی مجھے نمک سے رغبت ہے ۔ بہاڑیئے

نمک بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کے پہاڑوں میں نمک نہیں ہوتا صرف مٹی اور خواری ہوتی ہے۔ لہذا یہ لوگ اپنے پہاڑوں سے پیار کرتے ہیں اور ان کی مٹی کو ترستے رہتے ہیں۔ ایڑیاں تک رگڑتے ہیں۔ جناب والا ہم سرکار والا تبار کے نمک خوار رہتے ہیں۔ جی آپ درست فرماتے ہیں۔ نمک حاکموں کی ہڈیوں سے نہیں کھیوڑہ کی کانوں سے نکلتا ہے۔ یا شائد پھر حاکموں کی ہڈیوں سے ہی نکلتا ہے اور کھیوڑہ کے پہاڑوں سے نہیں نکلتا۔ یہ بات بھی معلوم ہے جناب کہ ہمارے سمندر کے پانی سے نمک نکالا جاتا ہے جیساکہ ہمارے پسینے سے بھی نمک نکلتا ہے لیکن جناب آپ غور فرمائیں کھیوڑہ کی کانوں، سمندر کے پانی اور اپنے پسینے کے آپ نمکخوار کیسے ہو سکتے ہیں؟ پہاڑ پہاڑ ہے، سمندر سمندر ہے اور پسینہ پسینہ ہے۔ نمک کھانے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ نوکری تو نہیں دیتے۔ میرا مطلب ہے یہ وسیلۂ روزگار تو نہیں ہیں نا۔ جناب آپ میرا مطلب سمجھتے ہیں نا! نوکری تو سرکار دیتی ہے اور ہم حاکم کی چاکری پر مجبور ہیں۔ آپ چاکری کو سمجھتے ہیں نا! جناب چاکری نہ ہو تو گھر کی رسوئی میں نمک نہیں پہنچ پاتا۔ میرا مطلب ہے جناب حق کی بات یہی ہے۔ ہم لوگ تو بندہ بشر ہیں۔ ہم نمکخوار سرکار کے ہوتے ہیں اور ایمان کی بات ہے حق بات ظالم اور جابر حاکم کے سامنے کہنے سے بھی نہیں جھجکنا چاہیئے۔ دانش اسی میں ہے یا شاید پھر دانش اس میں نہیں ہے! کیا کہا؟ جناب ٹھیک ہے۔ سرکار کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔ سرکاریں بدل جاتی ہیں۔ لیکن جناب کارِ سرکار کہاں بدلتا ہے؟ حاکم کا حکم اور نوکر کی چاکری نہیں بدلتی۔ میرا مطلب ہے جناب ہم نہیں بدلتے۔ ہم سرکاری منہ کو نہیں دیکھتے۔ جس نے ان کے منہ کو دیکھا اس نے منہ کی کھائی۔ ٹھیک ہے منہ آتے رہتے ہیں منہ جاتے رہتے ہیں۔ سورج کی کرنوں کی طرح جو کرن گزر گئی سو گزر گئی۔ جناب گزری ہوئی صبح کے پیچھے اندھیری رات میں گم گشتہ کرنوں کے تعاقب میں بھاگنا باؤلوں کا کام ہے۔ ہم جانتے ہیں، سب جانتے ہیں جس پر سرکار خوش اس پر سارا دربار خوش، اس کا سارا گھربار خوش۔ جناب وطن عزیز میں اسی کو خوش حال گھرانا کہتے ہیں!

نہیں نہیں اسے بُرا مت کہئے۔ سرکار ہر حال میں اچھی ہوتی ہے۔ نوکری دیتی ہے۔ اچھوں کو برا کہنا اخلاق باختہ فعل ہے۔ اخلاق باختہ فعل کی گردان سے آپ پاس کیسے ہوں گے؟ سرکار کبھی اچھی نہیں ہوتی؟ ایسا نہ کہئے جناب۔ ہم اچھے ہوں گے تو وہ خود بخود بہت اچھی ہو جائے گی۔ جناب میرا مطلب ہے ہمارے منہ یعنی زبان سے صرف خیر کی دعائیں

اچھا ہوتی رہتی ہیں - اپنی خیر منانا بہت بڑا کار خیر ہے - سرکار کے لئے اور کچھ نہیں ہو سکتا تو دست دعا بلند کرنا چاہئے - جناب ہماری دعا ہے ایک مرتبہ آپ سرکار کو خوب سمجھیں بس پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے - سب ٹھیک ہو جائے گا - جناب کان ادھر لائیے - ذرا اور قریب ! جناب آپ میرا مطلب سمجھتی ہیں نا ! کبھی وہی نا جو جب کہا تھا ! آپ پبلک میں اول فول نہ بکا کریں - وطن عزیز کی وسیع منڈی میں کیا بھروسہ کون کس کا ہے - کون جانے ؟ جناب ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہم اپنے ہیں ! اس کے علاوہ خوف کی ردا ہے - ہر آدمی، ہر بندہ بشر ڈرا ہوا ہے - آسیب سے کون نہیں ڈرتا جناب !

جی آپ نے پھر مذاق فرمایا ! میں قادیانی ؟ نعوذ باللہ ! ان سے مطلب ؟ کیا پوچھا ؟ میرا فرقہ ؟ جناب دیکھئے میں فرقہ پرست نہیں ہوں ! کیا فرمایا سنی ؟ نہیں جی میں وہ کہاں ہوں ؟ شیعہ ؟ جناب والا قربان جاؤں شیعوں پر مگر واللہ میں شیعہ نہیں ہوں - ناجی، خارجی ؟ جی ہرگز نہیں ہوں - دیو بندی ؟ جناب بس رہنے دیجئے بہت ہو چکی ! بالکل نہیں ہوں منصور حلاجی ؟ ہائے ! چہ نسبت خاک را با عالم پاک ! پھر تو آپ ضرور نظر بندی ہوں گے ؟ جناب ادھر آئیے - میری آنکھوں میں دیکھئے - آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں صرف نظریں ملا کر ! آپ کو کچھ نظر آیا ، کچھ نظر آیا جناب ؟ کیا فرمایا کیا فرمایا آپ نے ؟ فضا نظر آرہی ہے - دھند چھا رہی ہے - سماں بوجھل ہو رہا ہے - جی ہاں فضا دھندلائی ہوئی اور بوجھل ہے اور اب میری آنکھیں فضا کے بوجھ سے بند ہو رہی ہیں - میں شل ہو گیا ہوں ، بہت تھک گیا ہوں - جناب اب آپ مجھے سو جانے دیں - میں خواب دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں - ویسے بھی میرے سیاسۃ کا وقت قریب آپہنچا ہے - خدا حافظ ! آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے - یا شاید خوشی نہیں ہوئی ہے - یا پھر شاید تھوڑی سی خوشی ہوئی ہے اور تھوڑی سی نہیں ہوئی ! اب آپ چلے جائیں فوراً روانہ ہو جائیں - جناب قدم جلدی اٹھائیں آگے بڑھائیں - اندھیرا بڑھ رہا ہے - جائیے کہیں آپ کی نظر بندی نہ ہو جائے - ڈاکٹر صاحب آپ ذرا احتیاط سے چلا کریں ، میرا مطلب ہے رات کے پردے گر چکے ہیں - گلی میں گھرا اندھیرا ہے - جائیے اللہ آپ کا نگہبان ہو - خدا حافظ ! رب راکھا !

کالج کی بے فکر آزاد فضا میں رشید امجد کی ہم جماعت چند چنچل پری جمال طالبات بھی تھیں - ان کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا مقابلہ کڑا نہ تھا - اور رشید امجد انگلش چاکلیٹ

کلچر سے بھی مسلح تھا۔ ولایتی کلچر کی ٹائفیوں نے اکثر اسے حسینوں کے جھرمٹ میں یوں داخل کروادیا جیسے آج کل فوجی کالجوں میں حاضر سروس اور سابقہ فوجیوں کے بچوں کو بلاکاوش داخلہ مل جاتا ہے۔ وہ شامیں بے ارغوانی کے بغیر بھی رنگین تھیں۔ ایسے معطر لطیف ماحول میں یادیں جنم لیتی ہیں۔ پھر امتحان پاس ہوا۔ ساتھ ہی کالج کے صبح و شام، مباحثے، محبتیں، رقابتیں اور دل لگانے لگنے کی ساری دلفریب منافقتیں تمام ہوگئیں۔ تلاش روزگار کی سرسراہٹ اور نئی بادسموم میں دم گھٹنے لگا۔ ایم۔اے۔ کی ڈگری ہاتھ میں لئے یوں رشید امجد ایوب خاں کے مارشل لا کے دور میں داخل ہوگیا — پھر؟؟

پھر جناب ڈاکٹر صاحب میرا پہلا افسانہ سنگم ہے۔ جب یہ افسانہ قرطاس ابیض پر منتقل ہوا تو مجھے ایسا لگا میرے جسم کے ایک انجانے، خفتہ اور بند دروازے کا قفل کھل گیا ہے۔ میں نے حلقہ میں اسے پڑھا۔ داد کی مجھے پرواہ نہ تھی۔ بس پھر کام چالو ہوگیا۔ جناب میں نے ایک زمانے میں روزانہ ایک افسانہ لکھا ہے۔

جی ہاں، ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ ایوب خاں کا مارشل لا شباب پر تھا کہ ادبی افق پر چند بے فکرے انوکھوں کی سعی ہوشیار و بسیار سے نئے پن (NEWNESS) نے جنم لیا۔ پاکستان کے ادبی آسمان پر یہ انوکھی اڑن طشتریاں بے سمت اور دائیں بائیں سے لاپرواہ نمودار ہوئیں۔ حالات اور ان کے مضمرات سے یہ حضرات بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا بقائے ذات اور اس کے فروغ کے درد میں مبتلا یہ نیا گروہ ہر کہنہ روش، اور پارینہ روایات کے پیچھے لٹھ لے کر جت گیا۔ اس نرالے گروہ کا طغرائے امتیاز تردید تھا۔ اچھی بری طبیعاتی۔ مابعد الطبیعاتی، نفسیاتی اور جدلی مادیت میں گندھی ہر بات، ہر مفروضے، ہر کلیئے کو رد کرنا ان کے نزدیک اس انوکھے ادبی چلن کا عنوان تھا۔ اپنی ذات کو سیاسی وابستگی اور اخلاقی و سماجی ذمہ داریوں سے مبرا قرار دے کر، غیر منسلک سیاسی و سماجی جدیدیت کے علمبردار اس گروہ نے دانستہ مارشل لا کے شکنجے کے اثرات و مضمرات سے چشم پوشی کی اور اپنے ماحول کے انتہائی ڈراؤنے غیر یقینی حالات میں اپنے گرد خود غرضی کے خول کا محفوظ حصار کھڑا کر لیا۔ ان دانشوروں اور ادبار کی پورے معاشرے اور زبوں حال قوم سے مکمل طور پر لاتعلقی (ALIENNESS) سے دانشمند حکام وقت شناس اور صاحبانِ بست وکشاد بہت محظوظ ہوئے۔ خوش ہوئے۔ لہٰذا انھیں خوب کھل کھیلنے دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ اور ایوبی آمرانہ دور میں ایسی

مہمل، غیر ادیبانہ، غیر فطری جدیدیت ۱۹۶۸ء تک ردیت کا پھاوڑا لے کر وطن عزیز میں فعال، شعوری اور فطری وابستگی والے ادب کے لئے گہری، اندھی، بے نام قبریں کھودتی رہی۔ ایسی بے مروت، کٹھور اور گمراہ کن جدیدیت کی کوکھ کون سے کوٹھے پر پھوٹی اس کا سراغ نہیں ملا۔ لیکن ان میں افتخار جالب اور ڈاکٹر انور سجاد جیسے مشاہیر ہراول دستوں میں تھے۔ انھوں نے یہ انوکھا علم خوب لہرایا اور اس میں خاصا نام پایا۔

ترقی پسندوں کو گالی دینا ردیت کی شرط اول مقرر ہوئی۔ پھر انھیں بے سر و پا نا ان علمبرداروں کے نزدیک اپنے اپنے محفوظ حصار کو مزید مستحکم بنانے کی قدر اولیٰ قرار پائی تھی۔ نان کومٹڈ (NON-COMMITTED) یہ ٹولہ ادب کی ہر صنعت اور خیال کو رد کرنے میں باک محسوس نہ کرتا جو انسان کی خستگی، زبوں حالی اور بیچارگی کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتا ہو۔ حق بات کو برملا کہنے کے بجائے اسے بنا ڈکار لئے پی جانا اور سچ کو ہضم کر جانا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ زندگی سے متعلق کسی بھی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہر تحریر کو ریزہ ریزہ کرنا۔ اس کے پرخچے اڑانا اور رد کرنا اس فرقۂ ادب میں جرأت مندانہ فعل تصور کیا جاتا تھا۔ دراصل یہ ان کی ذات کا دانشمندانہ عمل تھا۔ یہ لوگ جان بوجھ کر اپنی اپنی ذات اور ضمیر کو اپنی ہی ذات کے خود غرض محل میں مقید و محفوظ کر چکے تھے ـــ کہا رشید امجد ایسی آزادانہ بے راہ روی ہمارے ادب میں ہپی ازم کے مترادف تھی۔ جناب یوں ہی سمجھ لیں۔ پھر شاعری میں مہمل استعارے استعمال ہونا شروع ہو گئے اور افسانے میں کہانی اور انسان دونوں ادبی ترقی کی شاہراہ پر کسی منزل پر پہنچنے کی بجائے مہملات کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ ان کرم فرماؤں نے گمراہی کا وہ کام کر دکھایا جو فرعون کو بھی نہ سوجھا تھا اور قاری ان کے نئے نیل کی گھمن گھیریوں میں گھر گیا ـــ کنفیوز ہو گیا ـــ پھر؟؟

جناب ڈاکٹر صاحب پھر ۱۹۶۸ء میں دور آمریت کے کرب سے لوگ بلبلا اٹھے۔ اور ان زیرک ہوشیار ہپی ادیبوں کے باوصف ایک غلغلۂ مستانہ بلند ہوا۔ عوام جاگ اٹھے۔ ایک تحریک ابھری۔ ایسی تحریک ابھری کہ سب کچھ اتھل پتھل ہوتا نظر آنے لگا۔ اور بدلتے حالات کے ساتھ نیونیس (NEWNESS) کے ان دانشوروں نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ پرانا جامہ آتار پھینکا اور عوامیت کا خوبصورت لبادہ اوڑھ کر انھوں نے باہر جھانکا۔ ان کے خیمے سے آواز بلند ہوئی۔ استعاروں میں شاعری کرنا منافقت ہے اور اس فرقے کے متعدد

ادبا روشعرا اپنے طرفداروں سمیت آناً فاناً اس تحریک میں کود پڑے ۔ اب انھوں نے اپنے انو کھے علم سرنگوں کر دیئے اور نالے جیو توڑ ڈالے ۔ ان میں سے متعدد ادبا روشعرا عوامی تحریک کے ریلے میں سرپٹ دوڑتے پائے گئے ۔ اب عوام سے ہٹ کر بقیہ سارا ادب ان کے نزدیک مہمل تھا ۔ پہیہ پورا گھوم چکا تھا ۔۔۔ پھر؟

پھر حالات نے ایک بار پھر الٹی کروٹ لی ۔ نیا مارشل لا آیا ۔ اور انھیں کے سرخیل کوٹ لکھپت جیل سے ہوتے ہوئے اپنے عاقبت اندیش یاروں کے طفیل مارشل لا کے ہیڈکوارٹر میں بیعت کرتے پائے گئے ۔ رشید امجد یہ تو ادبی دنیا میں خود غرضی سے سینچا ہوا لایعنی پودا تھا جس کی پیدائش خوف حرص اور قرب اقتدار کی خواہش کے واحد جرثومہ کی مرہون منت تھی ۔ یہ اسی آرزو کا کارنامہ تھا ۔ ڈاکٹر صاحب ! میرا مطلب ہے دیکھئے نا ! آپ سمجھتے ہیں یہ جو اس قسم کی نام نہاد ادبی تحریکیں ہیں ، یہ جو عمل اور ردعمل کا چکر ہے ۔ میرا مطلب ہے یہ جو لہر چلی تھی ، آپ جانتے ہیں نا ، یہ نیم پختہ اور خام تحریکیں جنھیں ادب کے نام پر آگے لایا گیا یا بڑھایا جاتا ہے ۔ وہ جناب میرا مطلب ہے سب فراڈ ہے ۔ یہ منافقت ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ محض فروعی قسم کے رجحانات ہیں ۔ لہٰذا ایسے رجحانات میں پلا ہوا ادیب آج ترقی پسندی کا جامہ زیب تن کر لیتا ہے تو کل چی گیویرا کا ، پھر انتہائی رجعتی حاکم وقت کے لئے مرصّع صدارتی (کسی تقریب کے لئے) تقریر تحریر کر کے نئی ٹوپی اوڑھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ قاری اس کی دانائی سے نادان ہے ۔

ایسے میں یعنی ایسے دور میں میرا مطلب ہے انصاف کے حاجت مندوں اور انصاف پسندوں کے لئے بڑی گھٹن ہے ۔ جناب بڑا فریب بڑی گھٹن کو جنم دیتا ہے

رشید امجد کی زبان نانک پورہ کی گلیوں میں گنگ تھی ، اب بولے چلے جا رہا تھا اور میں اس کے ذہن کے خلیوں میں دفن کرب اور دل کے درد دکھ کے قریب ہونے کی لاحاصل کوشش میں معروف تھا ۔ بیچارا رشید امجد جبر کی دنیا میں سخت جان ہائے ہی ذہن اور روح کو یک جان اور قائم رکھ سکتی ہے ۔ تمھارا علامتی افسانہ اور استعاراتی کاوشیں اور سارا ایسا ادب جبر کی کوکھ سے جنم لیتا ہے ۔ عالم جبریت میں سیاسی ، سماجی اور اقتصادی دباؤ کے بوجھ سے پ ی فضا مضمحل ہو جاتی ہے ۔ ایسے دور میں ادیب لامحالہ یا تو جبر کی زد میں آ کر اس دباؤ [illegible] جاتا ہے اور دم سادھ لیتا ہے یا چپ رہنے کی جگہ وہ جابرو

کی ہمنوائی میں STATUS QUE کا رطب اللسان ہو جاتا ہے کیوں کہ اسی میں وہ اپنی سلامتی وعافیت تلاش کرتا اور پاتا ہے۔ایک مقولہ ہے IF YOU CAN NOT BEAT THEM, JOIN THEM یہ حضرات اس غلط اور لاغر مقولے کے پابند نظر آتے ہیں۔یہ کمزور، بزدل اور ناتواں انسانوں کی راہِ فرار ہے۔تیسرے چند محدود دانشور ادبا، اور مفکرین خاموش رہنے کی بجائے جبر کی فضا میں سانس لیتے ہوئے تاثراتی اندازِ فکر میں تشبیہات اور استعارات کے رنگ وروغن سے اور کبھی کبھی تجریدی برش سے اپنے ادبی عمل میں مینا کاری کرتے ہیں۔ نقش ونگارِ حیات نکھارنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ نقش ونگار قاری کی قوت ابلاغ سے بالا ہوں اور اسے سمجھنے میں دقت ہو۔مگر ان محلات میں بات تلاش کی جاسکتی ہے۔ چوتھے ایسے دانشور بھی ہوتے ہیں جو چپ کا پیرہن آتار پھینکتے ہیں اور احتجاجی ادب تخلیق کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ یہ ایک نوعیت سے قلمی جہاد ہے۔جن کے نصیب میں یہ جہاد ودیعت ہوا ہے وہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ طاغوتی طاقتوں سے ٹکراؤ میں یہ اندیشۂ سود وزیاں سے گزر چکے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ کی بات برحق! لیکن میرے خیال میں روایت سے انحراف محض کسی فن پارے کو یا ادبی تخلیقی کاوش کو جدید نہیں بناتا۔یا روایت میں خالصتاً فنی تجربہ برائے تجربہ بھی جدید کے زمرے میں نہیں آتا۔ مجھے تو لفظ جدید کا بے مہارا استعمال ہی مشکوک نظر آتا ہے۔آپ جانتے ہیں بدلتے ہوئے زمانے کے نئے حالات میں نئے تقاضے جنم لیتے ہیں۔رشید امجد تو پھر ان نئے تقاضوں کو نئے مفہوم کے پیرہن میں ابلاغ عامہ کے روبرو پیش کرنا بھی تو ادیب اور شاعر کی سماجی، اخلاقی اور تاریخی ذمہ داری ہے۔اس ذمہ داری سے چشم پوشی اور پہلو تہی کیسے برتی جاسکتی ہے؟

جی ہاں ڈاکٹر صاحب ذمہ داری تو ہے! میرا مطلب ہے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ہر سطح پر سماجی اور ثقافتی ادراک رکھنے والے باشعور دانشور، ادبا اور شعرا اپنے نئے محسوسات کی دنیا میں نئے تجربات کے سہارے نئے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کی سعی کرتے ہیں اور زندگی کے نئے مطالب کو اظہار کے نئے قالب میں ڈھالتے رہتے ہیں تاکہ کسی انوکھے پن کی جریب سے ان کا روپ بگاڑتے جائیں۔ جدیدیت کا یہی مستحسن اور قابلِ فہم عمل اور رجحان ہے۔جناب جدیدیت درحقیقت روایت کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے

اور گذرے وقت کی لوریاں سنتے سنتے جوان ہوتی ہے ۔ یہ زندگی کے تسلسل کی ہی ایک کڑی ہے ۔ پوچھا اور جدید ترین ادب ؟ وہ کیا ہے ؟ رشید امجد نے آگے پیچھے نظر دوڑائی پھر بولا جناب یہ مجذوب کی بڑ ہے ۔ کہا رشید امجد ادب میں انوکھے نرالے لایعنی تجربات سے اجتناب برتنا بالغ نظری کی دلیل ہے ۔ کچے پکے تجربات اور عملیات سے عقل انسانی کو ضعف پہنچتا ہے ۔ تجربہ برائے تجربہ کے شوق میں سبقت لے جانے کی آرزو تضیع اوقات کے علاوہ آرزو کی رسوائی بھی تو ہے ۔ ڈاکٹر صاحب ہے ۔۔ اور بالکل یہی بات ہے ۔

پوچھا سمبل ازم اور تجریدیت ؟ بولا جناب سمبل ازم کی امتیازی خاصیت یہ ہے کہ الفاظ کا ایسا استعمال ہو کہ مفہوم نہ صرف ذومعنی ہو بلکہ ہمہ جہت بھی ہو ۔ اور قاری جان جائے کہ معاملہ کیا ہے ؟ کیا بات ہو رہی ہے اور تجرید کے میدان میں الفاظ کی تصوراتی نشست و برخاست کچھ اس انداز سے ترتیب پاتی ہے کہ قاری اپنے تصور کے زور سے کہانی کی رو یا لہر کے قریب پہنچتا ہے ۔ پھر اسی لہر کے ساتھ ساتھ چل کر بات کو پاتا ہے ۔ تجرید میں سمبل کا سہارا نہیں لیا جاتا ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی فن پارے میں سمبل ازم اور تجریدیت شانہ بشانہ اپنے اپنے جوہر دکھا رہی ہوں ۔ اردو ادب میں ایسے افسانے موجود ہیں ۔ جناب بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قاری تجریدی تحریر کی لکیروں میں ہاتھ پاؤں مارتا گم ہو جاتا ہے ۔ کہانی یا تحریر کا مفہوم اس کے پلے نہیں پڑتا ۔ اس کے سر سے گزر جاتا ہے ۔ ظاہر ہے سمبل ازم کی نسبت تجریدی کہانی دقت آمیز ہوتی ہے اور خاصی ذہنی مشقت کے بعد سمجھ آتی ہیں ۔ جی کیا فرمایا یہ کسی تحریک کی نمائندگی کرتی ہیں ؟ ہرگز نہیں ! جناب والا اردو ادب میں ان کی حیثیت ایک رجحان کی سی ہے ۔ تحریک کسی نظریئے یا مخصوص مسلک کے ادب کو کہا جا سکتا ہے ۔ علامتی تجریدی قسم کی تحریروں کو تحریک کا درجہ دینا جائز نہیں ہے ۔ ادب کے دریا میں یہ ایک موج کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ ان میں پرانی چٹانوں سے ٹکرانے کی کتنی سکت ہے ۔ ان کی افادیت اور مقصدیت کا فیصلہ وقت کرے گا ۔ ان کا مستقبل کیا ہے اس کا فیصلہ بھی مستقبل ہی کرے گا ۔ وقت بہت بڑا جج ہے ۔

کند ہم جنس بہ ہم جنس پرواز کے مصداق لوگ الگ ذاتی گروہ بندی ، نظریاتی گروہ بندی ، سیاسی جماعتیں وغیرہ وغیرہ غالباً اسی مقولے کی رو میں بناتے ہیں ۔ رشید امجد گروہ بندی کا قائل ہے لیکن اس کے گروہ میں یکساں نظریات و احساسات ، حسیات اور

سیاست کو چنداں دخل نہیں ہے، محض دلبستگی کا معاملہ لگتا ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ اس کے ہاں اکثر ایک دوسرے کو تاکتے رہتے ہیں۔ یا تو یہ از خود زاغوں کے تصرف میں ہے یا پھر ہنس کی چال چلتے چلتے ڈولنے لگتا ہے۔ اب اس کی اپنی جنس مشکوک ہوگئی ہے۔

اس کے اکثر ہم جنسوں کی پرواز میں مطلق کوتاہی نہیں آتی اور باد مخالف کی تندی انھیں اونچی چٹانوں پر بٹھا دیتی ہے۔ انھیں بدترین قحط سالی میں بھی رزق کی مار نہیں پڑتی۔ سوائے اعجاز راہی کے! وہ اپنے راستہ کے اعجاز کا شکار ہے۔ وہ مار کھاتا ہے اور ہاتھ پاؤں مارنے سے باز نہیں آتا۔ ویسے بھی وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بیقرار چیتے کی طرح شکار کی جستجو میں رہتا ہے۔ شکست کی اسے پرواہ نہیں، غم نہیں ہے۔ ولولہ جانانہ اور غوغائے دلبرانہ کا بھرا فتراک کاندھے پر لٹکائے غم روزگار سے لاچار و آزردہ وہ اسلام آباد سے پشاور تک کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔ یہ رشید امجد کا پچیس برس پرانا یار ہے!

لحن داؤدی سے آزاد، فقیہہ شہر کی طرح اشتغال دلانے میں یکتائے روزگار، ہمہ وقت اندھی چوکھی چلانے والا سیانا، جو گزند سے پرہیز کرتا ہے، یاروں کا بیمار ساز اور اغیار کا بیمار دار ہر کسی کا دم ساز ـــــ رشید امجد کا ۱۴ سال پرانا یار ہے۔

اس کا یار منظر الاسلام جو اکثر رشید امجد کے ساتھ لاہور شہر میں گھوڑے بیچنے خوشی خوشی جایا کرتا تھا، اب اپنے گھوڑے بیچ کر اسلام آباد ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب کی رکھ میں پناہ گزیں ہے اور چڑھتے سورج کی کرن اولیں کے ساتھ ہی ورد کرتا ہے۔ سبحان تیری قدرت، سبحان تیری قدرت! اب اسے سائیس کی حاجت نہیں رہی ہے۔ فی زمانہ دانا دنکا کی تلاش اور اس کا پیار گھوڑوں کی جستجو اور فروخت سے زیادہ قسمت آزما ہے۔ طالع رقیب کی اسے پرواہ نہیں۔ لیکن اگر وہ زیادہ چمکنے لگے تو تلملا کر زیادہ دہکنے کی حسرت میں ماند پڑ جاتا ہے۔ شاہسواروں کی رکاب میں پاؤں ڈالنا قسمت کو انگاروں بھری قبر میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ اور منظر الاسلام جینا چاہتا ہے اور درازیٔ عمر کے لئے اپنے خضر راہ شورش کا عصا تھا راہ و راہِ خاموش چلے چلا جا رہا ہے۔ یہ رشید امجد کا بیس سال پرانا بچھڑا یار ہے۔

اور پھر منشا یاد اس کا پرانا اوورسیئر، جسے سی۔ ڈی۔ اے۔ کی سلطنت کے عیش میں یاد رشید امجد نہ رہی اور اسلام آباد کا پلاٹ اس سے منہ موڑ گیا۔

اور پھر مسیح آہوجہ اپنے جہنم میں کے ساتھ اور شبنم مناروی ـــ مشتے از خروارے ہیں۔

یہ سب فضل والے علم و دانش کی پری سے سلوک سیف الملوک کرنے والے شہزادے کوہ قاف کے جغرافیے میں گرم جھیل کے ارد گرد تیر و تفنگ لئے بھٹک رہے ہیں۔

ان بھانت بھانت کے لوگوں میں رشید امجد دائیں بائیں ٹہلتا رہتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ ذی تھنکنگ کے دائرے میں فریڈم آف تھاٹ کا قائل ہے۔ وہ حدود و قیود سے نفرت کرتا ہے۔ حد نظر تک لبرل باؤنڈری کے اندر ہر مقام اس کا منظور نظر ہے۔

ایک دن میں پریشان تھا۔ رشید امجد نے پوچھا نصیب دشمناں طبیعت تو برقرار اور بحال ہے؟ کہا رشید امجد دشمن موجاں مار دے نیں۔ یہاں خرچا پورا نہیں ہوتا۔ گزارہ نہیں ہوتا۔ مہنگائی قحط کی حدود کو چھو رہی ہے۔ مسکرا کر بولا ڈاکٹر صاحب آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ بازار میں جتنے دام بڑھتے ہیں آپ لوگ اتنے ہی مریض سے وصول کر لیتے ہیں۔ مارے تو ہم لوگ گئے۔ ہم جیسوں کا تو بھرتہ ہو گیا ہے۔ تنخواہ دار کدھر جائیں۔ گزارہ دشوار ہو گیا ہے۔ احتجاج کا یارا نہیں۔ نوکری زد میں آتی ہے۔ میرا مطلب ہے تنخواہ بڑھنے کی امید نہیں ٹیوشن ہم نہیں کرتے۔ یہ جانے دیں کہ کیوں نہیں کرتے۔ جناب ٹیوشن۔ میرا مطلب ہے ٹیوشن اچھی چیز نہیں۔ نہ طالب علم کے لئے نہ استاد کے لئے یہ مناسب اور موزوں ہے۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ سب مارے گئے۔ انتہا درجہ کی گرانی ہے۔

گرانی سے بات فراوانی کی طرف سرک گئی۔ بولے ہمارے وطن میں آج کل دو چیزوں کی فراوانی ہے۔ پوچھا کون سی دو اشیا کی فراوانی ہے؟ بولے جناب گرانی طبع اور منافقت کی۔ گرانی پر قابو پانا آسان نہیں۔ یہ وہ جن ہے جس پر کوڑے، جرمانے اور زنداں خانے فیل ہو چکے ہیں۔ یہاں مارشل لا عاجز ہے۔ وہ ہر شے پر قابو پا سکتا ہے لیکن گرانی کی ضرب سے چت پڑا عوام کی طرف بٹر بٹر دیکھ رہا ہے۔ اور عوام نڈھال مارشل لا کو دیکھ رہے ہیں۔ دونوں شل ہیں۔

اور جناب منافقت معاشرے کی شاہ رگ سے گزرتی ہوئی وطن عزیز کے جسم کی باریک ترین رگوں میں سرایت کر گئی ہے۔ اس کے سدباب کی جستجو ہے نہ تلاش۔ نہ فلک تک حل کہیں نظر آتا ہے۔ اور رشید امجد منافقت کے سائے میں پلنے والی معصوم نئی جنریشن سے خوف کھاتا ہے۔ کہتا ہے ڈاکٹر صاحب معصوم جنریشن خونخوار

ہوجائے گی۔ یہ انسان کا گوشت کھانا شروع کردے گی۔ ہائے ربّا میرے!

کہا رشید امجد اب تو بھاؤ پوچھتے ہوئے ڈوبتے سورج کی شفق کے موافق رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ یہاں عزتِ نفس کے علاوہ ہر چیز بڑھ رہی ہے اور ہر طرف سے بے بھائی کی برس رہی ہیں۔ ڈر ہے عزتِ نفس اور پاکیزگی اور ذہنی مہارت لٹ نہ جائے۔ غلاظت اور تعفن کے گھیرے میں وضو قائم رکھنا شیوۂ پیغمبری ہے۔ رشید امجد قریب آیا۔ آہستہ سے بولا ڈاکٹر صاحب بھلائی اسی میں ہے وہ کم تولیں اور ہم کم بولیں۔

اور میں فکر میں ہوں کہ منافقت کی اس گرم بازاری میں صدق وصفا والے دلوں کو ہمہ وقت ریا کی تپتی سلاخوں سے داغا جاتا ہے۔ آئین شہریار ماری ہے۔ سلوک کی طریقت تپیدہ ذہنوں پر دغا کے تپتے تیل کا چھڑکاؤ کرتی ہے۔ جہاں ہر وقت بات بنائی جاتی ہے اور معاملہ فہمی کی صفت معاملہ بندی سے انصاف، شرافت اور ایمان سے پہلو بچاتی، پتے جھاڑتی لوسر بازی کی دہلیز پار کر جائے۔ جہاں جہانِ نو کی تعمیر کے معماروں کے لئے زنگی بوسیدہ کدالیں لئے آدم نو کے لئے قبریں کھود رہے ہوں جھوٹ کا دیدار عام ہو اور سچ بغل میں منہ چھپائے ناموس کے بچے کھچے سانسوں کے طفیل زندہ ہو۔ وہاں میں فکر میں ہوں۔ فکر ہے کہ ہم مکمل طور پر لٹ نہ جائیں۔ اور رشید امجد کے چہرے پر قبل از وقت گہری جھریاں ابھر آئی ہیں۔ تفکر اور تدبر کے عصا پر گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے۔

منافقت کی محیر العقول داستانیں سناتے ہوئے رشید امجد رکا پھر بولا ڈاکٹر صاحب دم گھٹتا ہے۔ کہا رشید امجد پوری تانی بگڑ چکی ہے اور بگڑی ہوئی تانی کی کوئی تند اسے سلجھا نہیں سکتی۔ یہ شق بیکار ہے۔ جب سارا معاشرہ ناسور بن جائے اور اس میں کیڑے کلبلا رہے ہوں تو اینٹی بایوٹک کی سٹیج گذر چکی ہوتی ہے اور جب گناہ اس قدر پھیل جائے بڑھ جائے اور اسے گناہ تصور کرنے والے گناہ گار ٹھہرائے جائیں اور گناہوں میں نہائے ہوئے منافقین معتبر ٹھہریں تو پھر آپریشن ضروری ہو جاتا ہے۔ پھر اتھل پتھل ــــ رشید امجد تلملایا ــــ بولا ڈاکٹر صاحب بس بس، سننے کی تاب نہیں ہے۔ رہنے دیں ایسی باتوں کو ــــ شام اتر چکی ہے۔ یہ معاشرہ شاید ٹھیک ہو جائے گا، یا پھر شاید ٹھیک نہیں ہوگا۔ مہنگائی کی آندھی گزر جائے گی یا پھر شاید نہیں گزرے گی۔ ہر حال ڈاکٹر صاحب آج یہ ا

سیاست تو تباہ ہو ہی چکا ہے۔ اب گھر چلتا ہوں ۔ رخسانہ سرگراں ہوگی۔ یا شاید رخسانہ سرگراں نہیں ہوگی۔ سعدیا کی گڑیا بہت مہنگی تھی۔ حُسن کا ناچنے والا بندر آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ میں دونوں نہیں خرید سکا۔ صرف ننھے حسین کے لئے مصنوعی شہد والی چوسنی لی ہے۔ رخسانہ مجھ پر ضرور گرم ہوگی یا شاید پھر نہیں ہوگی ۔ اگر گرم ہوگی تو کہہ دوں گا یہ چیزیں بازار سے غائب ہیں۔ صرف چوسنیاں ہیں ۔ وہ مجھے جانتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب میں اس کا خاوند ہوں۔ ملت کی بیریاں کہاں بولتی ہیں ۔ اچھا جناب میں چلا۔ خدا سب کا نگہبان ہو۔ □

رشید امجد

۱۸۵۔اے، نانک پورہ
راولپنڈی، پاکستان

سہ پہر کا مکالمہ

صبح سے پہلے بیوی نے دیکھا کہ وہ بستر پر نہیں ہے۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہ باتھ روم میں نہ ہو، اس نے سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ باہر والا دروازہ اندر سے بند تھا، دوبارہ ایک ایک کمرہ دیکھا پھر بڑے بیٹے کو جگایا۔

"کیا بات ہے؟ بڑا بیٹا ہڑبڑا کر اٹھا۔

"تمھارے ابو" آواز رندھ گئی۔

"کیا ہوا ___ کیا ہوا؟" بیٹا اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"تمھارے ابو ___ گھر میں نہیں ہیں۔"

بڑے بیٹے نے بے یقینی اور جھنجھلاہٹ سے اس کی طرف دیکھا ___ "کیا مطلب؟"

"میں نے ایک ایک کمرہ دیکھ لیا ہے، وہ کہیں نہیں ہیں۔"

گفتگو سن کر بیٹی بھی اٹھ گئی ___ "تو پھر کہاں ہیں؟"

"باہر والا دروازہ بھی اندر سے بند ہے۔" اب آنسو روکے نہیں رکتے۔

چند لمحے عجیب پُراسرار سکوت۔

پھر وہ سب اپنے اپنے بستروں سے نکل کر اسے تلاش کرتے ہیں۔ باتھ روم میں سونے کے کمروں میں، ڈرائنگ روم میں، باورچی خانے میں اسٹور میں۔

بڑا بیٹا کہتا ہے ___ "کہیں صبح سویرے باہر نہ نکل گئے ہوں۔"

ماں جھنجھلا کر کہتی ہے "لیکن دروازہ اندر سے بند ہے۔"

چھوٹا بیٹا چند لمحے سوچتا رہتا ہے ___ "کیا معلوم رات ہی کو گھر نہ آئے ہوں۔"

بیٹی نفی میں سر ہلاتی ہے "میں نے خود دروازہ کھولا تھا، جب انھوں نے گھنٹی

بجائی تھی۔"

چھوٹا بیٹا اسے گھورتا ہے "تم تو ہر وقت اپنے ہی خیالوں میں رہتی ہو، کیا پتہ وہ باہر ہی رہ گئے ہوں اور تم نے دروازہ بند کر لیا ہو۔ یا وہ گھنٹی ہی بجاتے رہے ہوں اور تم نے دروازہ کھولا ہی نہ ہو۔"

بیٹی غصے سے اسے دیکھتی ہے "تم تو ہر وقت میرے ہی پیچھے پڑے رہتے ہو۔"

ماں بستر پہ ہاتھ پھیرتی ہے۔"رات کو وہ یہاں سوئے تھے۔"

بڑا بیٹا مشکوک نظروں سے ماں کی طرف دیکھتا ہے ـــ "کیا معلوم؟"

چھوٹا بیٹا کہتا ہے "مجھے ساری رات باہر کھڑ کھڑ سنائی دیتی رہی ہے، میرا خیال ہے وہی ہوں گے، وہ ضرور رات کو باہر ہی رہ گئے ہیں۔"

"کیا معلوم وہ گھر ہی میں کہیں ہوں؟" ماں بڑبڑاتی ہے۔

وہ پھر اسے تلاش کرنے گھر کے کونے کونے میں پھیل جاتے ہیں۔

ایک ایک کمرہ دیکھتے ہیں۔

"رات کو انھیں کھانا کس نے دیا تھا؟" بڑا بیٹا ماں اور بہن کی طرف دیکھ کر سوال کرتا ہے۔

ماں کو یاد آتا ہے اس نے انھیں کھانا دیا تھا، پھر یاد آتا ہے شاید اس نے نہیں دیا تھا۔

بیٹی کو یاد آتا ہے شاید اس نے ـــ یا شاید اس نے نہیں۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپ رہتی ہیں۔

"سوال ہے اب انھیں کہاں تلاش کیا جائے؟" بڑبڑاتا ہے۔

"کیوں نہ ان کے سارے دوستوں کے گھر فون کیا جائے۔ شاید دیر ہونے کی وجہ سے کہیں رک گئے ہوں۔" چھوٹا بیٹا رائے دیتا ہے۔

بیٹی جھنجھلا کر کہتی ہے "میں نے خود دروازہ کھولا تھا۔ وہ رات گھر آئے تھے۔ کیوں امی؟"

ماں کو کچھ یاد نہیں آتا۔ کبھی خیال آتا ہے وہ آئے تھے۔ اس نے ان کے لئے کھانا گرم کیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر کتاب۔ کبھی خیال آتا ہے

وہ آئے ہی نہیں ۔ وہ ساری رات انتظار اوڑھ کر ان کی راہ تکتی رہی ہے ۔

"کیوں امی ؟"

"لیکن فون کرنے میں کیا حرج ہے ؟"

"دروازہ اندر سے بند ہے ۔" بڑا بیٹا بڑبڑاتا ہے ۔ "اس کا مطلب ہے وہ آئے ہی نہیں ، اور اگر آئے ہیں تو پھر کہیں گئے نہیں ۔"

تو پھر کہاں ؟

وہ پھر اسے تلاش کرنے کے لئے گھر کے کونے کونے میں پھیل جاتے ہیں ۔

ایک ایک کمرہ ، ایک ایک کونا ، ایک ایک الماری ۔

"میرا خیال ہے وہ رات کو آئے ہی نہیں ۔" بڑا بیٹا صوفے میں گرتے ہوئے مایوسی سے کہتا ہے ۔ "امی آپ بتائیں نا !"

ماں کو کچھ یاد نہیں آتا ۔ کبھی خیال آتا ہے اس نے کھانا گرم — کبھی نہیں ، ساری رات انتظار

"مجھے کچھ پتا نہیں ، کچھ معلوم نہیں ۔" وہ روہانسی ہو جاتی ہے ۔

بیٹی آگے بڑھ کر اسے سنبھالتی ہے ۔

چھوٹا بیٹا فون کی طرف چلا جاتا ہے ۔

بڑا بیٹا کہتا ہے — میں ذرا باہر تو دیکھ لوں ، کہیں وہ ابھی تک دروازے پر ہی نہ کھڑے ہوں ۔ وہ باہر جاتا ہے پھر اندر آکر مایوسی سے سر ہلاتا ہے ۔

ماں اب رونے لگتی ہے — وہ کبھی رات کو باہر نہیں رہے ، یہ پہلی رات ہے ۔"

"خالی بستر پر شکنیں ہیں بھی اور نہیں بھی ۔"

وہ رات کو سوئے تھے یا شاید نہیں ۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹا بیٹا منہ لٹکائے آتا ہے ۔ "وہ کسی دوست کے یہاں بھی نہیں ۔"

"تو پھر کہاں گئے ؟" اب بیٹی کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملانے لگے ہیں ۔ کہیں میں نے واقعی انھیں باہر چھوڑ کر دروازہ بند نہ کر لیا ہو ؟ کبھی یاد آتا ہے وہ آئے تھے گھنٹی کی آواز سن کر اس نے دروازہ کھولا تھا ۔ انھوں نے اسے پیار کیا تھا پھر اس کے پاس

سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ کبھی یاد آتا گھنٹی کی آواز سن کر اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا تھا۔ گھنٹی بار بار بجی رہی تھی مگر اس نے ؟"

"نہیں نہیں وہ اندر آئے تھے، وہ اندر آئے تھے، وہ ہزیانی انداز میں چیختی ہے۔" وہ اندر نہیں آئے تھے — نہیں — نہیں"۔

ماں اور بڑا بیٹا اسے شانوں سے پکڑ کر صوفے پر دھکیل دیتے ہیں۔

چھوٹا بیٹا بڑبڑاتا ہے "وہ آئے ہی نہیں۔ اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا ہوگا۔"

بڑا بیٹا اسے ڈانٹتا ہے "تم چپ رہو"۔

خود وہ رات گئے تک ناول پڑھتا رہا تھا۔ کبھی یاد آتا کہ گھنٹی کی آواز آئی تھی اور کسی نے دروازہ کھولا تھا اور کوئی اندر آیا تھا۔ کبھی یاد آتا ہے کہ گھنٹی بجی ہی نہیں۔ چھوٹا بیٹا اصرار کئے جاتا ہے "رات کو کوئی ضرور باہر تھا، ساری رات کھڑکھڑ ہوتی رہی ہے۔"

اسے کبھی یاد آتا ہے کہ ساری رات کوئی دیواروں کھڑکیوں اور دروازوں پر دستک دیتا رہا ہے۔ کبھی یاد آتا ہے کہ وہ ساری رات مزے سے سویا رہا ہے، ذرا بھی آواز نہیں آئی۔

"تو وہ گھر کے اندر بھی نہیں باہر بھی نہیں" ماں افسوس سے سر ہلاتی ہے۔

دنوں، سالوں اور مہینوں کے کئی بند تھان خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ رنگ برنگی کھٹی میٹھی تصویریں، ذائقے، کڑواہٹیں، مٹھاسیں، دکھ سکھ کے کئی لمبے سال سمٹ کر سوئی کے ناکے میں سما جاتے ہیں۔

"تو وہ نہیں ہیں" وہ چیخ مار کر بیٹی سے لپٹ جاتی ہے۔

دروازہ اندر سے بند ہے، یا شاید نہیں ہے۔

کسی نے دروازہ کھولا، شاید نہیں کھولا۔

وہ ساری رات باہر ہی کھڑے رہے یا اندر آگئے۔

شاید، یا شاید نہیں۔

وہ سارے ڈرائنگ روم میں صوفوں میں دھنسے اپنے اپنے جنم کو سمیٹ رہے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ بس کبھی سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں اور دوسرے

ہی لمحے مجرموں کی طرح سر جھکا کر اپنے اپنے صوفوں میں دبک جاتے ہیں۔
ایک عجیب پراسرار خاموشی۔
اور ان سب سے الگ وہ ـــــ جسے یہ سارے تلاش کر رہے ہیں، لکھنے کی میز پر بیٹھا سر جھکائے کتاب پڑھے جا رہا ہے۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر ان کی کھوکھلا ہٹیں، اداس چہرے اور مایوس باتیں سنتا ہے اور پھر سر جھکا کر پڑھنے لگتا ہے۔
یہ کہانیاں بھی کمبخت عجیب ہوتی ہیں، کبھی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں اور کبھی شروع ہو کر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ □